اس فقرے میں ایسی کوئی بحث نہیں۔ ساری پونجی رفتہ رفتہ لگائی ہو یا ایک
ہر حال میں یہ فقرہ درست ہے۔ ٹھیک اسی طرح زیرِ بحث فقرے میں
سروکار نہیں ہوتا کہ تین طلاقیں الگ الگ مجلسوں یا مہینوں میں دی گئیں یا
تو مطلب بس یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جتنی طلاقیں ڈالنی ممکن تھیں وہ سب
الگ الگ دی گئی ہوں چاہے اکٹھی۔ ایسی حالت میں اس فقرے کا
ہے جو آپ لے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ مفہوم بائیس روایات کو مشکوک بنا
بہت یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں مفہوموں کی گنجائش ہونے کے باعث اس
استدلال کریں نہ ہم۔

مزید یہ دیکھئے کہ جو راوی ابو سلمہ یہاں واقعہ بیان کر رہے ہیں، ان
چند اور بھی روایات میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مسلم کی پہلی سند کے مطابق
یہ ہیں:۔ ان ابا عمرو بن حفص طلقها البتة وَهُوَ غَائِبٌ (فاطمہ
اس حال میں بیوی کو طلاقِ بتّہ دی کہ وہ شہر سے غائب تھے۔)

دوسری سند کے مطابق ان کے الفاظ یہ ہیں:۔ اِنّہ طلقها
(انھوں نے اپنی بیوی کو حضورؐ کے زمانے میں طلاق دی تھی)

تیسری سند میں وہ کہتے ہیں کہ مجھے فاطمہؓ بنت قیس نے خبر دی کہ
طلقها (ان کے مخزومی شوہر (ابو عمروؓ) نے انھیں طلاق دی)

چوتھی سند میں وہ فرماتے ہیں کہ ابو عمروؓ نے تین طلاقیں دیں اور اس

پانچویں اور چھٹی سند میں انھوں نے فاطمہؓ کا بیان ضمیرِ متکلم ہی میں نقل
البتة (مجھے میرے شوہر نے طلاقِ بتّہ دی)

غور فرمائیے۔ آپ صرف ایک سند کے الفاظ کو اس طرح پکڑ کر
بلاریب و شک وہی الفاظ ابو سلمہ نے بولے ہوں حالانکہ اس تفصیل
کہ یہ بعینہٖ ان کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس روایت کو نقل کرنے والے
اپنے اپنے الفاظ میں ان کا مفہوم ادا کر دیا ہے۔ لہٰذا آپ کے جس اس
ہی پر ہو وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اگر آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں
ابو سلمہ کی طرف منسوب کر رہا ہے وہ بعینہٖ ابو سلمہ کے الفاظ ہیں تو پھر

نقل ہوئے ہیں۔ ان کی آپ کیا توجیہ کریں گے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ
ہوگا کہ ابو عمروؓ نے باہر سے طلاق بھیجی اور یہ بھی کہا ہوگا کہ طلاق دیکر
ہے یہ متضاد باتیں ہیں۔ اگر روایتوں کے منقولہ الفاظ کو بعینہٖ ابو سلمہ کا
کر وہ تضاد بیانی کے مرتکب ٹھیریں گے دوسری طرف یہ عجوبہ ماننا
میں انھوں نے چھ طرح کے جملے بولے۔

دارِ قطنی میں دو سندوں کے ساتھ ان ہی ابو سلمہ کا واقعہ مذکور ہے
ان سے کسی گفتگو کے دوران یہ بات کہی کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا
وہ بولے حمص بن عمرو بن المغیرہؓ نے اپنی بیوی فاطمہؓ بنت قیس کو ایک ہی
طلاقیں دی تھیں، ہمیں تو نہیں اطلاع ملی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسپر
ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلا اعتراض تین کو تین مان لیا تھا۔
(ملاحظہ ہو دارِ قطنی مع التعلیق المغنی ص ۴۲۹ و ۴۳۰)

روایت کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش رہ گئی کہ فاطمہؓ کو تین طلاقیں الگ الگ
ہم عرض کر ہی آئے ہیں کہ مسلم شریف کی جس حدیث سے آپ
اس میں وہ فقرہ جس پر آپ کے استدلال کا مدار ہے ابو سلمہ کا نہیں
نے اپنے الفاظ میں ابو سلمہ کا مطلب بیان کیا ہے۔ لیکن اگر ابو سلمہ
وہ ذو معنیٰ ہے۔ مبہم و مجمل ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم دارِ قطنی کی مذکورہ
کر دیا۔ یہ کہ فاطمہؓ کو ان کے شوہر آخر تک تین طلاقیں دیتے چلے گئے۔
یک مجلس۔ اور یہ آپ نے دیکھ لیا کہ مسلم میں ابو سلمہ کی مزید پانچ روایتیں
ان کے الفاظ میں بلا ریب یہ گنجائش موجود ہے کہ تین اکٹھی طلاقوں پر
کتنی نامناسب بات ہے کہ یہ سب نظر انداز کر کے فقط ایک روایت سے
اور دعویٰ کریں کہ بس یہ الفاظ ہیں جو ابو سلمہ نے اپنی زبان سے
حالانکہ اگر دوسرے شواہد اور قرائن اس کے خلاف نہ ہوتے تب بھی
سکتی تھی کہ اس مکالمے پر نظر ڈالی جائے جو خود فاطمہؓ اور رسول اللہ (صلی
نیز ان گیارہ روایات کو دیکھا جائے جن میں راویوں نے
نقل کیا ہے اور جن میں کہیں ایک جگہ ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے

بیان کی ہے جسمیں انہی ابو سلمہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اپنی بیوی کو ایک کمرے میں

یہ پتہ چلے کہ تین طلاقیں مختلف اوقات میں دی گئی تھیں بلکہ خارجی و داخلی قرائن
ہیں کہ تینوں طلاقیں اکٹھی دی گئی تھیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ فاطمہؓ کے شوہر یمن گئے ہوئے تھے وہاں
فاطمہؓ کو وہ طلاق لکھ بھیجی جو ان طلاقوں میں سے بچ گئی تھی۔

یہ روایت بے شک اس میں صریح ہے کہ تیسری طلاق الگ دی گئی
بھی پتہ نہیں چلتا کہ پہلی دو الگ الگ دی گئی ہوں۔ حالاں کہ اگر دو ایک
کردی گئی ہوں تو پھر اس دعوے کی کوئی پشت ہی نہیں رہتی کہ تین اکٹھی واقع

علاوہ اس کے ذرا اس کی سند ملاحظہ کرلیجئے: امام زہریؒ اسے عبیداللہ
روایت کرتے ہیں، خود آنجناب نے بھی یہ سند نقل کی ہے لیکن ادراک
یہ روایت متصل نہیں منقطع ہے اور منقطع روایت قابلِ احتجاج نہیں ہوتی۔
اتنا اشارہ کافی تھا۔ لیکن اہلِ علم تو اب آٹے میں نمک ہو گئے ——
بھی کرنی ہی ہوگی

عبیداللہؓ کا بیان یہ ہے کہ ———— ابو عمرو بن حفصؓ (فاطمہ
علی (کرم اللہ وجہ) کے ساتھ یمن گئے، پھر انھوں نے اپنی بیوی فاطمہؓ کی طرف
جو فاطمہؓ کی طلاقوں میں سے باقی تھی۔"

عبیداللہؒ یہ دعویٰ نہیں کررہے ہیں کہ خود فاطمہؓ نے یا ان کے شوہر
بیان کیا۔ مضمون سے بھی ظاہر ہے کہ عبیداللہ مدینے میں ہیں اور عمرؓ یمن
ہیں۔ لہٰذا خود ابو عمروؓ سے تو عبیداللہ سُن نہیں رہے۔ کسی اور ہی سے سُن کر
کیا۔ اس "اور" کا کوئی تعارف روایت میں نہیں۔ اسی کا نام انقطاع
اعتبار سے حدیثِ صحیح میں اتّصال ضروری ہے۔ اگر ایک ہی واقعے کے
متصل دونوں طرح کی روایتیں موجود ہوں تو التفات متصل کی طرف کیا جا

آپ ناواقفیت کی بنا پر شاید یہ کہیں کہ امام مسلمؒ نے تو اپنی کتاب
جمع کرنے کا التزام کیا ہے اب عامر جیسا طفلِ مکتب اس میں منقطع روایات
یہ تو بڑی دیدہ دلیری ہے۔

جواب گوش گذار کیجئے کہ یہ طباعی نالائق عامر کی نہیں بلکہ ماہرِ فن اسا

ہیں کہ مسلم میں متعدد حدیثیں مقطوع یا منقطع ہیں۔ مثلاً علامہ ابن امیر الحاج
میں بازری کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ صحیح مسلم میں چودہ حدیثیں مقطوع ہیں
ارشاد فرمایا ہے کہ مسلم میں تقریباً ستر مقامات ایسے ہیں جہاں
تو متصل بیان کی ہے لیکن فی الحقیقت وہ منقطع ہے۔ اور بعض نے
زیادہ بھی مقامات ہوسکتے ہیں۔

تدریب الراوی" میں رشید العطارؒ کا قول نقل کیا ہے کہ صحیح مسلم میں
سندوں میں انقطاع ہے۔ حتّیٰ کہ ٹھیک اسی حدیث کے بارے میں
یہ فقرہ منقول ہے۔ وحدیث عبید اللہ بن عبد اللہ بن
عمرو بن حفص فی الطلاق قال فی سماع عبید اللہ من ابی عمرو
بھی ان روایتوں میں ہے جن میں انقطاع واقع ہوا ہے۔ عبیداللہؓ نے فاطمہؓ کے
سنا ہو اس میں کلام ہے۔)

بھی المحلّیٰ میں اس انقطاع کی نشاندہی کی ہے (جلد ۱۰ صفحہ ۱۷۲)
کہ اس انقطاع سے آپ کا استدلال تو بے شک رد ہو جاتا ہے۔ لیکن
میں کوئی فرق نہیں آتا کیوں کہ جہاں کہیں امام مسلمؒ نے غیر متصل سند قبول کرلی
نے کوئی دوسری متصل سند بھی پیش کردی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی
مثلاً یہیں دیکھئے۔ انھوں نے شعبی اور ابوسلمہ عن فاطمۃ
اتصال پیدا کیا۔ ابو سلمہؒ کی چھ روایات کا ذکر آ ہی چکا، شعبیؒ کی بھی اتنی ہی روایتیں
ان میں یا تو طلاقِ بتّہ کا لفظ ہے یا تین طلاقوں کا۔ پھر کیا اس سے
بھی کوئی ہوگی کہ آپ ایک منقطع روایت کو اصل بنا کر مسلم کی باقی ۲۳
کو توڑیں مروڑیں اور فنِ حدیث کو قبر میں دفن کردیں۔

دلیل

گفتگو ہو رہی ہے چلئے کچھ دیر کو مان لیجئے کہ ان کے الفاظ کا وہی مطلب ہے
اور فنی اصول و قواعد کو بھی طاق میں رکھ دیجئے۔ لیکن بہت ہی محترم دوست!
کہ ابو سلمہؒ ہوں، عبیداللہؒ ہوں، بعد کے کوئی بھی بزرگ راوی ہوں۔

وہ فاطمہؓ کی کیفیتِ طلاق میں جو بھی الفاظ استعمال کر رہے ہیں وہ الفاظ بہر حال
بارگاہ میں تو نہیں پہنچے تھے ۔ دیکھنا اصلاً یہ ہے کہ رسُولُ اللہ (صلی اللہ
کیا کہا ـــــ گیارہ روایتیں مُسلم ہی سے پیشِ خدمت کر دی گئیں کہ فاطمہؓ
کی اطلاع دی تھی ۔ حضورؐ کو پہلے سے کوئی علم نہیں تھا کہ کب کتنی طلاقیں
فرماتے ہیں تو بس یہ کہ کتنی طلاقیں دی گئیں ؟ ۔ جواب ملتا ہے تین ۔ گویا
دفعۃً تین دے دی گئی ہیں ۔ عدت پوری باقی ہے اسی کے بارے میں
ہیں ۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقوں کا پڑنا مشکوک ہوتا
انھیں تین مان لیتے ۔ بعد کے راوی اپنے الفاظ میں جو بھی طرزِ تعبیر اختیار کریں
آخر بارگاہِ رسولؐ والے مکالمے پر کیا اثر پڑتا ہے ۔

مُسلم شریف سے فارغ ہو کر اب دوسری کتبِ حدیث کی طرف آ
(۱) مسندِ احمد، ابو داؤد اور طحاوی کی روایت یہ ہے ان اباعمرو
البتۃَ وَھُوَ غَائِبٌ (فاطمہؓ کے شوہر ابوعمروؓ نے فاطمہؓ کو ایسی حالت
دی جب کہ وہ شہر سے غائب تھے ۔)
(۲) مسندِ احمد کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں :۔
وطلقھا ثلاثًا جمیعًا (انھوں نے تین طلاقیں اکٹھی دے دیں)
(۳) نسائی کے الفاظ یہ ہیں :ــــ انہ ارسل الیھا بثلاث تطلیقات
اپنی بیوی فاطمہؓ کو تین طلاقیں بھیجیں ۔)
(۴) دارِ قطنی کے الفاظ یہ ہیں :۔ ثلث تطلیقات فی کلمۃ واحدۃ
منہ النبیؐ (ایک ہی فقرے میں تین طلاقیں دے دیں ۔ پس رسول اللہؐ
جُدا کر دیا ۔)
(۵) ابن ماجہ عنوانِ باب قائم کرتے ہیں ــــ "باب اس آدمی کے
جس نے ایک ہی مجلس میں بیوی کو تین طلاقیں دیں ۔"
پھر اسی کے تحت یہی حدیثِ فاطمہؓ بیان کرتے ہوئے فاطمہؓ کا
ہیں کہ میرے شوہر نے مجھے تین طلاقیں دیں جبکہ وہ یمن جانے والے تھے

فاطمہؓ بنت قیس کو اکٹھی تین طلاق دیئے جانے کے کتنے قوی
میں موجود ہیں لیکن حد درجہ کی ستم ظریفی کے سوا اسے کیا کہا جائے کہ
فرما رہے ہیں کہ تین الگ الگ طلاقوں کے ثبوت روایات میں
ہے آپ نے بالکل ہی کوشش نہیں کی کہ چند اپنے مطلب کی کتابیں
اثباتِ کتب بھی دیکھ لیں اور اندازہ تو لگائیں کہ ستاروں سے آگے جہاں
کم مُسلم ہی دیکھ لی ہوتی ۔

شبہات کو بھی رفع کر لیجئے جو ابن قیمؒ وغیرہ کی تحریروں سے آپ کے
بارے میں پیدا ہو گئے ہیں ۔
میں بصراحت یہ آیا ہے کہ " فاطمہؓ کو ان کے شوہر نے اکٹھی تین طلاقیں
کے بارے میں آپ نے اِدھر اُدھر سے یہ ریمارک تو نقل کر دیا کہ :۔
"ان الفاظ کو شعبیؒ سے صرف خالدؒ نے نقل کیا ہے ۔"
کہ یہ ریمارک اہلِ فن کے نزدیک غیر مفید ہے ۔ ایک شیخ کے متعدد
کو بیان کریں اور ان میں صرف ایک شاگرد ایسا ہو جس کے بیان میں
کوئی زائد بات پائی جا رہی ہو تو دیکھا یہ جائیگا کہ یہ زائد بات صرف
۔ جیسے طاؤسؒ کے معاملے میں آپنے دیکھا کہ وہ اپنے شیخ سے حضرت ابن عباسؓ
اکٹھی طلاقیں ایک ہوتی ہیں ۔ مگر دوسرے شاگرد یہ نقل کرتے ہیں کہ تین ہوتی ہیں ۔ اب
لہٰذا ایک کو رد کر کے ہی دوسری کو قبول کیا جا سکتا ہے ۔ مگر یہاں
رہے ہیں وہ دوسرے شاگردوں کے بیان سے متصادم کی ضد
ت یا اس پر تشریحی اضافہ ہے ۔ باقی شاگرد اگر یہ نقل کر رہے ہوتے
طلاقیں الگ الگ اوقات میں دی تھیں تب بے شک خالدؒ اور
ہوتا اور خالدؒ کی روایت مُنکَر مان لی جاتی ۔ لیکن سب کا بیان
دی تھیں ۔ پھر کون صاحبِ عدل ہے جو یہ کہدے کہ ان کے اور
تضاد ہے اور خالدؒ کا بیان رد کر کے ہی دوسروں کا بیان صحیح مانا

جاسکتا ہے۔ خالدؒ تو تین کی کیفیت بیان کر رہے ہیں اور باقی شاگردوں کے بیان میں اس کیفیت سے انکار نہیں ہے۔ فنِ حدیث کا اصول ہے کہ بعض ثقات کے بیان پر کسی کا اضافہ صحیح ماننا پڑے گا۔ اگر کوئی واضح قرینہ یا ثبوت اس کے غلط ہونے کا نہ ہو۔ آپ کا ریمارک صرف اس صورت میں آپ کو مفید ہو سکتا ہے کہ یا تو شعبیؒ کے شاگرد خالد کو کتبِ فن کے آئینے میں غیر ثقہ ثابت کر دیا جائے یا ان کے بیان کو دوسرے ثقات کے بیان کی ضد قرار دیا جائے۔ یا پھر یہ انکشاف فرمایا جائے کہ نالائق عامر عثمانی اصول غلط بیان کر رہا ہے——— یقین کیجئے، ہم صرف طوالت کے خوف سے بہ زیادہ حوالوں کا اہتمام نہیں کر رہے ہیں۔ ورنہ جو بھی اصولِ حدیث ہم نے ذکر کیا اس کے متعدد کتب، اصول ہمارے سامنے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ جن صاحب نے بھی یہ شوشہ نکالا ہے کہ یہ الفاظ محض خالدؒ کے ہیں اس لئے حدیث مشکوک ہوگئی وہ یا تو فن سے واقف نہیں یا وقتی غائب دماغی کا شکار ہوئے ہیں۔

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

"اب یا تو اس حدیث کو مضطرب مانیئے اور اس صورت میں اس سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے ورنہ صحیح ترین روایت اور اکثر راویوں کی روایت کی رُو سے اس کا مسئلۂ زیرِ بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے تین بار میں تین طلاق دینے سے ہے۔"

ہمارے محترم دوست! کیا آپ نے حدیثِ مضطرب کی تعریف اور اس کا حکم کسی کتابِ فن میں دیکھا ہے؟۔ نہیں دیکھا یا دیکھ کر بھول گئے۔ اوّل تو یہ حدیث قطعاً مضطرب نہیں۔ ہم نے ابھی آپ کے آگے بہتیری روایتیں تو ایسی پیش کر دیں جن میں صراحت ہے کہ طلاقیں ایک ساتھ دی گئی تھیں۔ متعدد ایسی پیش کیں جن میں طلاقِ بتہ کی خبر دی گئی اور بتہ عموماً وہی تین طلاقیں کہلاتی تھیں جو بیک وقت دی جائیں۔ متعدد ایسی پیش کیں جن میں مطلق تین طلاقوں کا ذکر ہے۔ تفصیل کچھ بھی نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں اکٹھی طلاقوں پر محمول کرنے میں کوئی مانع نہیں۔ اضطراب اس وقت ہوتا ہے جب تطبیق ممکن نہ ہو۔ لیکن یہاں تو صریحاً موافقت، ومطابقت پائی جارہی ہے۔ دس آدمی کہتے

انہوں نے عارفہ کو تین طلاقیں دیں۔ چار آدمی کہتے ہیں اکٹھی تین دیں۔ بتایئے ان دونوں بیانوں میں ٹکراؤ کہاں ہوا جو آپ اضطراب کی بات کہہ رہے ہیں——— رہیں وہ دو روایتیں جنہیں آپ نے مسلم سے اٹھا کر اضطراب کی بنیاد بنایا ہے ان کی تحقیق ہم پیش ہی کر چکے کہ ایک ان میں منقطع ہے اور دوسری دو معنوں کی متحمل۔ ایک وہ معنیٰ ہیں جو آپ لیتے ہیں اور روایاتِ ثابتہ کے خلاف ہیں اور ایک وہ جو ہم لیتے ہیں اور روایاتِ ثابتہ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ لہٰذا بہت سے بہت یہ ہو سکتا ہے کہ اس ایک روایت کو نہ آپ اپنے لئے دلیل بنائیں نہ ہم۔ یہ کیا زبردستی ہے کہ آپ اپنے متعین کردہ معنیٰ کو وحی بنا کر اضطراب کا حکم لگائیں اور ہمارے عرض کردہ معنیٰ کو یکسر نظر انداز فرما دیں۔

پھر ایک منٹ کو مان ہی لیجئے کہ اضطراب ہے لیکن یہ بھی آپنے سوچا کہ اس اضطراب کا محل کیا ہے۔ اضطراب واقع ہو رہا ہے قصّے سے غیر متعلق راویوں کے الفاظ میں——— مگر جو فاطمہ تو خود صاحبِ واقعہ ہیں اور حضورؐ کی خدمت میں ان کے تشریف لیجانے ہی نے واقعہ کو حقیقتاً حدیث بنایا ہے کیا ان کے اس بیان میں بھی کوئی اضطراب پایا جاتا ہے جو انہوں نے بارگاہِ رسولؐ میں دیا ہے۔ تیسؔ کے قریب روایات ہم نے آپ کے آگے رکھ دی ہیں۔ ان میں ڈھونڈیئے کیا کوئی ایک بھی روایت ہے جو مسلم کی اس صحیح و متصل حدیث سے مختلف ہو کہ فاطمہؓ سے حضورؐ نے پوچھا تمھیں کتنی طلاقیں دیں؟۔ فاطمہؓ نے کہا تین، اور اسی جواب پر تین کا نفاذ ہو گیا۔ اگر ایسی روایت کہیں ہے تو لایئے تب یقیناً ہم نفسِ حدیث میں اضطراب تسلیم کر لیں گے مگر آپ کہاں سے لائیں گے جب کہ ابنِ قیمؒ بھی نہ لا سکے۔ لفظی تخالف دیگر راویوں میں ہو رہا ہے اور اضطراب پیدا کر رہے ہیں آپ دورِ رسالتؐ کے ثابت شدہ واقعہ میں۔

مزید جو کچھ آپنے کہا اس پر آپ ذرا حاضر دماغی سے خود بھی غور کریں گے تو نادم ہونگے۔ آپ نے کیا کہدیا۔ صحیح ترین روایت اور اکثر راویوں کی روایات سے تو کجا؟۔ ضعیف اور قلیل راویوں کی روایات سے بھی یہ ثابت نہیں ہو رہا ہے کہ اس واقعۂ فاطمہؓ کا تعلق تین بار تین طلاق دینے سے ہو۔

ایک مثال سُنیئے۔ احادیث میں ذکر آیا ہے کہ حضورؐ کو نماز میں سہو ہوا۔ یہ سہو چار رکعت والی نماز میں ہوا تھا۔ اب اصحاب میں مختلف ہیں کہ یہ نماز ظہر کی تھی یا عصر کی اور اس میں بھی مختلف ہیں کہ آپؐ نے دوسری

رکعت پر سلام پھیر دیا تھا یا تیسری رکعت پر اور اس میں بھی مختلف ہیں کہ سجدۂ سہو کیا
یا نہیں اور اس میں بھی مختلف ہیں کہ نماز سے فارغ ہو کر آپ سیدھے حجرے میں تشریف
لے گئے تھے یا مسجد ہی میں بیٹھے رہے تھے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہاں اضطراب پایا جا رہا ہے۔ سب میں تطبیق ناممکن
لیکن کوئی محدث ایسا نہیں جس نے اس اضطراب کی دلیل سے نفسِ واقعہ ہی کا انکار کیا
ہو۔ یعنی یہ کہہ دیا ہو کہ نماز میں بھول کا کوئی واقعہ ہی حضورؐ کو پیش نہیں آیا۔ نفسِ واقعہ کا
کیسے ممکن ہے جب کہ وہ قدرِ مشترک کے طور پر تمام روایات میں موجود ہے۔

بٹھیک اسی طرح اگر فاطمہؓ بنتِ قیس والے واقعے کی روایات میں ابنِ قیم وغیرہ
خیال کے مطابق اضطراب مان ہی لیں تو اس سے اس واقعہ کا انکار تو نہیں کیا جا
کہ فاطمہؓ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں۔ تین طلاقیں کس طرح دی گئیں اس کی تحقیق کا
اور واحد ذریعہ اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جملہ مضطرب روایات کو ایک طرف رکھ
آپ اور ہم یہ دیکھیں کہ حضرت فاطمہؓ کی گفتگو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کیا ہوئی
الحمد للہ! اس گفتگو کی صحیح روایات مسلم ہی میں موجود اور دوسری کتابوں میں بھی
کیا یہ روایات بھی اُس مفروضہ اضطراب کی بنیاد پر رد کی جا سکتی ہیں جس کا کوئی تعلق
رسالتؐ والے مکالمے سے نہیں ہے۔

کیا آپ نہیں جانتے کہ اکثر روایات روایت بالمعنی کا مصداق ہیں یعنی الفاظ راوی
اپنے ہوتے ہیں یا الفاظ کا بڑا حصہ اپنا ہوتا ہے۔ ان الفاظ کا مفروضہ اضطراب
روایت میں کمزوری کیسے پیدا کر سکتا ہے جو حضورؐ کا اور صاحبِ معاملہ خاتون کا مکالمہ
پیش کر رہی ہو۔

پھر تماشے کی بات ایک اور بھی ہے۔ آپ نے طلقها آخر ثلاث تطلیقات
کے الفاظ والی روایت کو شد و مد سے اپنے لئے دلیل بنایا حالانکہ یہ ابو سلمہؓ کی روایت
ہے اور ابھی ہم نے دکھایا کہ ان ہی ابو سلمہؓ کی مزید پانچ روایتیں اسی جگہ موجود ہیں۔
جو کچھ اضطراب ہے وہ بھی سامنے آ چکا۔ لیکن یہ اضطراب آپ کو بالکل نہیں کھٹکتا اور استدلال
کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ لیکن جمہورِ امت جب مسلم شریف ہی کی ۲۲ روایتوں سے استدلال
ہیں جن میں قطعاً اضطراب نہیں تو آپ اضطراب پیدا کرنے کے لیے دو روایتیں جن

...ایک منقطع ہے اور خواہ مخواہ اضطراب پیدا کر کے یہ حکم بھی لگا دیتے ہیں کہ اضطراب
... استدلال ساقط ہوا۔
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے!
مزید یہ کہ آپ سب حضرات کے پاس اپنے موقف کے حق میں لے دے کے
ایک روایت ہے ابن عباسؓ والی اور آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ
... ہے۔ اس قدر مضطرب کہ تطبیق کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اس کی سلسلے میں
اضطراب کو بھول ہی گئے ہیں۔ انصاف اس کو تو نہیں کہتے ہیں کہ جب خرید و تو ایک
تولو اور بیچو تو دوسری ترازو استعمال کرو۔ ہماری تمام فنی وضاحتوں کے باوجود اگر
حدیثوں کو "اضطراب" کے عذر سے ناقابلِ احتجاج گمان کرتے ہیں تو دیانت کا
تقاضا تھا کہ آپ حضرات ابن عباسؓ والی روایت سے احتجاج کا تصور بھی نہ کرتے۔
... جب کہ ابنِ عباسؓ کا فتویٰ آپ کے خلاف ہو۔
تفہیم میں مولانا مودودی نے بھی رقم فرمایا ہے کہ "خود ابو الصہباءؓ کی اُن
... میں اضطراب پایا جاتا ہے جو ابنِ عباسؓ کے قول کے بارے میں ان سے مروی
... (ج ۵ ص ۵۶۰) جو دیکھنے کا ارادہ کرے وہ بخاری، مسلم اور ابو داؤد کو سامنے
... دیکھ سکتا ہے۔ لیکن آپ حضرات خدا جانے کیوں اس قدر جری ہو گئے ہیں
... اضطراب کو نظر انداز کر کے چند فقرے ان روایتوں میں سے اُکھاڑ لاتے ہیں اور دعوے
... ہیں کہ دیکھو یہ ہے صحیح حدیث! ــــ یہ ترکیب دنیا پرستوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔
... تو ماشاء اللہ خادمِ شریعت اور داعیِ حق ہیں۔

حدیثِ عائشہؓ

آنجناب نے بخاریؒ سے حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث نقل فرمائی جس کا خلاصہ
... کہ رفاعہؓ نامی شخص نے اپنی بیوی کو جو طلاق دی تھی اسے حضورؐ نے مغلظہ
... قرار دیا تھا۔ (یعنی تین طلاق)
اس میں بیوی نے جو الفاظ حضورؐ کے آگے کہے ہیں وہ یہ ہیں:۔ ان رفاعۃ
... فبت طلاقی۔ (مجھے رفاعہؓ نے طلاقِ بتّہ دی) اب آپ حافظ ابنِ حجرؒ کا

سہارا لے کر یہ تعریف فرماتے ہیں کہ طلاقِ بتّہ اگرچہ تین طلاقوں کو کہتے ہیں لیکن
نہیں کہ وہ تینوں ایک ساتھ دی گئی ہوں۔ پھر آپ ابنِ حجرؒ ہی کی رہنمائی میں بخاری کی
اسی واقعے کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ رفاعہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق
آخری طلاق دی تھی۔ (فطلقھا آخر ثلاث تطلیقات) گویا اس طرح
اپنی دانست میں ثابت کردیا کہ یہ تین طلاقیں بیک وقت نہیں دی گئی تھیں۔
ان کو تین طلاق قرار دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اکٹھی تین طلاقوں کو آپؐ نے تین
یہ بھی دراصل کسی اور کی تقلید جامد ہے اور آپ نے ذاتی تحقیق و تفحّص
لیا۔ ذرا حاضر دماغی کے ساتھ سُنیئے کہ اوّل تو ہم کتنی بار دہرا چکے ہیں کہ مذکورہ فقرہ
مفہوم وہ نہیں ہے جس کو آپ قطعی تصوّر کئے چلے جا رہے ہیں۔ یہ فقرہ اس وقت
جا سکتا ہے جب کوئی شخص بیک وقت تینوں طلاقیں دے ڈالے۔ پھر ا
نہ مانیں۔ مگر یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ ایک شخص دن کے دس بجے ایک طلاق دیتا ہے۔
بج کر پانچ منٹ پر دوسری۔ پھر دس بجکر سات منٹ پر تیسری۔ تو جب تیسری اس
بلا تکلف کہا جا سکے گا کہ اس نے تین طلاقوں کی آخری طلاق دے ڈالی۔ ا
لیجیے۔ مجلس ایک ہے۔ تینوں طلاقوں میں چند منٹوں کا فصل ہے۔ آپ جو خواہ
الگ الگ مجلسوں کی گردان کرتے چلے جا رہے ہیں اس کا سوال یہاں پیدا نہیں
بھی تین واقع ہو گئیں۔

اور اسے بھی چھوڑیئے ذرا فن کی عینک تو لگایئے۔ یہ جو بخاری کتاب الا
کی روایت آپنے نقل کی کیا اس میں آپ صریحاً یہ نہیں دیکھ رہے کہ الفاظ راوی
نہ کہ خود رفاعہؓ کی بیوی کے ــــــــ رفاعہؓ کی بیوی کا بیان رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) کی خدمت میں کیا تھا اسے آپ نے خود بخاری کی حدیث اوّل میں نقل
"مجھے رفاعہؓ نے طلاقِ بتّہ دی۔" ــــــــ اب آپ یہ تو جان ہی
بتّہ کا محاورہ تین طلاقوں کے لئے تھا۔ بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ
اطلاق طلاقِ مجموع پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور الگ الگ وقتوں کی طلاقوں پر بھی
عبارت آپ نے ابن حجرؒ کی نقل کی اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ "بتّہ عام
مصداق اکٹھی تین طلاقیں بھی ہو سکتی ہیں اور الگ الگ تین طلاقیں بھی۔"

آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس اصطلاح کا مصداق اکٹھی تین طلاقیں بھی ہو سکتی
ــــــــ اب دیکھئے۔ مطلّقہ عورت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف یہ
ہے کہ مجھے میرے شوہر نے طلاقِ بتّہ دی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے ایک ایسا
کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ الگ الگ تین طلاقیں دیں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اکٹھی تین دیں
اللہ علیہ وسلم) بالکل دریافت نہیں فرماتے کہ نیک بخت! تمھارا کیا مطلب ہے۔ طلاقیں
دی گئیں یا الگ الگ؟۔ اس کے برخلاف آپؐ دو ٹوک فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ
کے لئے حلال نہیں ہو سکتیں جب تک دوسرا شوہر تم سے جنسی تعلق قائم نہ کر لے
ہے کہ تین طلاقیں چاہے الگ الگ دی جائیں چاہے ایک ساتھ رسول اللہؐ
ہونے کا فیصلہ فرماتے تھے۔

کیا ہمارے اس استدلال میں کوئی عقلی یا نقلی نقص ہے؟ اور یہ بتایئے کہ
اس واقعے کو خواہ کسی بھی انداز و الفاظ میں نقل کرے۔ کیا اس سے نفسِ واقعہ میں
۔ آپ غور سے دیکھیے۔ بخاری کی اس دوسری روایت میں بھی حضرت عائشہؓ نے یہی فرمایا ہے کہ رفاعہؓ
طلاقِ بتّہ دی۔ یہ نہیں فرمایا کہ تین طلاقوں کی آخری طلاق دی... اب حضرت عائشہؓ سے
راویوں کا جو سلسلہ ہے ان میں سے کسی راوی نے بتّہ کی تشریح اپنے
دی تو یہ تشریح آپ کے لئے مفید کیا ہوگی جب کہ حضورؐ نے بہرحال فقط لفظِ بتّہ پر
فرما دیا تھا۔ ہمارے نزدیک تو راوی نے کوئی غلط بیانی نہیں کی، بلکہ وہ الفاظ
جو لفظِ بتّہ کی طرح دو معنیٰ کے متحمل تھے۔ لیکن آپ جب اس پر اصرار کرتے
ثلاث تطلیقات کا واحد مطلب یہ ہے کہ الگ الگ وقتوں میں تین طلاقیں
تو پھر یہ وضاحت کرنا آپ کا کام ہوگا کہ جب خود مطلّقہ عورت حضورؐ کے سامنے
استعمال کر رہی ہے یعنی بتّہ تو بعد کے کسی راوی کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ
دو ممکن مفہوموں میں سے۔ ایک کا تعین کر دے۔ اور ناحق طور پر وہ ایسا کر بھی
سے اِس امرِ واقعہ میں کیا فرق واقع ہو سکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے
کا ہی لفظ پر دے دیا تھا۔

ــــــــ ہمارے محترم دوست تفکر! ۔ یہ فنِ حدیث ہے انتہائی بیدار مغزی
ذہن کا طالب ــــــــ ہمارا قیاس ہے کہ بخاری بھی آپ نے براہِ راست نہیں

دیکھی. دیکھتے تو عین ممکن تھا کہ فریب خوردگی سے بچ جاتے۔ یہ حدیث امام
عنوان کے تحت لائے ہیں وہ یہ ہے من اجاز ریا۔ مَن جوّز) طلاق
مطلب یہ ہوا کہ اس باب کے تحت وہ چیزیں بیان ہوں گی جو بعض حضرات
ثابت کرتی ہیں کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا گناہ نہیں ہے۔ (مثلاً امام شافعیؒ اور
کے نزدیک[1])

اب یہ رفاعہؓ کی بیوی والی حدیث یہاں صاف طور پر یہ معنٰی د
رفاعہ نے تین اکٹھی طلاقیں تو بہرحال دی تھیں جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔
اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اکٹھی تین دینا گناہ نہیں ہے۔ ورنہ حضورؐ اس
ہونے کا اشارہ کرتے۔ اور کچھ لوگ اس استدلال کو دوسرے دلائل
یہ کہتے ہیں کہ اکٹھی تین طلاقیں پڑ تو جاتی ہیں مگر دینے والا گناہ گار بھی ہوتا
کسی کا اختلاف نہیں کہ رفاعہؓ نے تین اکٹھی طلاقیں دی تھیں۔ کسی سے مراد
ہیں ورنہ آپ کو اور ابنِ قیمؒ وغیرہ کو تو بہرحال اختلاف ہے مگر آپ کا اختلاف
قاطع نہیں ہو سکتا۔

نیز بخاری میں اسی جگہ ایک اور بھی حدیث ہے جس کا کوئی ذکر آپ
نہیں حالانکہ آپ نے اپنی دانست میں وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جن
استدلال کرتا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:-

عن عائشة ان رجلاً طلق	حدیث عائشہؓ بیان فرماتی ہیں
امرأته ثلثا فتزوجت	اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں:
فطلق فسُئِلَ النبی صلی اللہ	اور نکاح کر لیا۔ اس کے بعد
علیہ وسلم اَتحِلُّ لِلاوّل	نے بھی اسے طلاق دیدی۔
قالَ لاحتّٰی یذوق	حضورؐ سے سوال کیا گیا تو حضورؐ
عُسَیلَتھَا کماذاق الاوّل	عورت اس وقت تک شوہرِ اول
	نہیں کر سکتی جب تک شوہرِ ثانی
	جسمانی تعلق قائم نہ کرلے
	کیا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

❖ ❖

❖

[1] یہ "مثلاً" ہمارا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ابنِ حزمؒ تو امام بخاریؒ کے کافی بعد کی شخصیت

خلاصہ یہ کہ اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے جتنی بھی حدیثیں بیان کی ہیں ان میں خواہ
یا لفظ ثلاثہ اس کا مطلب امام موصوف کے نزدیک ایک ہی وقت کی تین طلاقیں ہیں اور موصوف
جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ایک بدیہی بات ہے جسمیں کسی کو شبہ نہیں۔ اسکے باوجود اگر
ابن حجرؒ یا کسی اور کی عبارتوں کا کمزور سہارا لے کر ان احادیث میں شبہ اور تذبذب
کرنا چاہتا ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے اجماع پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔

حدیث عُوَیمر العجلانیؓ

عویمرؓ نے اپنی بیوی سے لعان کیا تھا۔ پھر بیوی کو ایک زبان میں تین طلاقیں حضورؐ ہی کے
دیں۔ حضورؐ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔
یہ حدیث خود آپ ہی کے بیان کے مطابق بخاری اور دوسری مستند کتب میں موجود ہے
اصول یہ ہے کہ جو فعل حضورؐ کے سامنے کیا گیا اور حضورؐ نے اس پر گرفت نہیں کی وہ
جائز ہوگا۔ اس اعتبار سے اکٹھی تین طلاقوں کا جواز اس حدیث کے ظاہر الفاظ میں

اب اپنے اس علم کلام پر نظر ڈالئے جو آپ نے اس حدیث کی تاویل میں استعمال فرمایا ہے۔
آپ نے زبانی ہم سے فرمایا تھا کہ صرف تفسیر قرطبی کے سلسلے میں تو ایسا ہوا ہے کہ آپ نے
نہیں دیکھی بلکہ کسی اور کتاب سے اس کا حوالہ دیدیا مگر اور کتابوں کے سلسلے میں ایسا نہیں
اس کا مطلب یہ ہے کہ امام سرخسیؒ کی المبسوط آپ نے خود دیکھی ہے۔ سرخسیؒ ہم احناف کے
جلیل القدر فقیہ ہیں۔ آپ اپنے اس خیال کی تائید میں کہ حضورؐ کا خاموش رہنا یہ ثابت نہیں
کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہوں۔ سرخسیؒ کی عبارت المبسوط سے نقل کرتے ہیں جسمیں
انہوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضورؐ نے عویمرؓ کو اس لئے نہیں ٹوکا کہ عویمرؓ
غصے میں تھے۔ عین ممکن تھا کہ آپؐ کے ٹوکنے پر ان کی زبان سے کوئی کفریہ بات
نکل جاتی یا وہ آپؐ کی تنبیہ کو نظر انداز کر کے مبتلائے کفر ہو جاتے۔
ٹھیک ہے سرخسیؒ نے ایسا ہی لکھا ہے لیکن کیا آپ ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ
یہ نقل مغالطہ دہی سے خالی ہے؟
المبسوط کو پھر کھولئے۔ آپ مقام کا حوالہ نہ دیں مگر ہم دیتے ہیں کہ چھٹی جلد کا صفحہ ۵۷

ملاحظہ فرمائیں۔ امام سرخسیؒ باب قائم کرتے ہیں:۔

"باب اس شخص کے رد میں جو کہتا ہے کہ طریق سُنّت سے
ہٹ کر طلاق دو گے تو طلاق نہیں پڑے گی۔"

ہم طول سے بچنے کے خوف سے صرف ترجمہ کر رہے ہیں۔ اگر کسی کو یہ شکایت [illegible] ترجمے میں خیانت کی ہے تو اصل متن بھی پیش کر دیا جائے گا۔ اس باب کا پہلا [illegible]

"اس مسئلہ میں ہمارا (یعنی ہم اہلِ سُنّت کا) اور
شیعوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔"

سنا آپ نے؟ امام سرخسیؒ یہ نہیں سمجھتے کہ اہلِ سُنّت کے درمیان بھی [illegible] ہے۔ بس شیعوں کی مخالفت کا انھیں اعتراف ہے۔ اب وہ اختلاف کی دو [illegible] ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص بیوی کو حالتِ حیض میں یا اُس طہر میں جس میں اس [illegible] صحبت کی ہے طلاق دے تو جمہور فقہاء کے نزدیک طلاق پڑ جاتی ہے اور شیعوں [illegible] نہیں پڑتی[1] ——— دوسرے یہ کہ اگر کوئی کسی بھی وقت اکٹھی تین طلاقیں [illegible] اہلِ سُنّت کے نزدیک تینوں پڑ جاتی ہیں اور شیعوں کے فرقۂ زیدیہ کی رائے یہ [illegible] ایک پڑتی ہے۔ اور فرقۂ امامیہ کی رائے یہ ہے کہ ایک بھی نہیں پڑتی۔ اور یہ لوگ [illegible] کہ یہی قول ہے حضرت علیؓ کا۔ حالانکہ یہ حضرت علیؓ پر خالص افترا ہے۔ چنانچہ [illegible] کتابُ الطلاق میں ذکر کیا جائے گا کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کا فتویٰ [illegible] تینوں پڑ جاتی ہیں۔

یہ بیان کرنے کے بعد امام سرخسیؒ ایک دلیلِ عقلی دیتے ہیں جس کا خلاصہ [illegible] حضورؐ نے جو طلاقِ سُنّت کا طریقہ واضح فرما کر اکٹھی تین دینے کو منع کیا یہ بجائے [illegible] بات کا ثبوت ہے کہ تین پڑ جاتی ہیں۔ ممانعت ایسے ہی فعل کی کی جاتی ہے جس کے [illegible] نہ کرنے کی قدرت و اختیار آدمی کو حاصل ہو اور وہ فعل واقع ہو سکتا ہو۔ تین طلاقیں [illegible] ہی نہ ہو سکتیں تو کس میں قدرت تھی کہ انھیں واقع کر دے اور کیوں ان سے روکا [illegible] اس کے بعد سرخسیؒ ایک لطیف منطقی نکتہ پیش کرتے ہوئے دو مثالیں دیتے [illegible] غصب کی ہوئی زمین میں نماز منع ہے لیکن پڑھ لو تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور دیکھو [illegible] کے بعد خرید و فروخت ممنوع ہے لیکن کوئی اس کا مرتکب ہو تو بیع منعقد ہو جاتی [illegible]

[1] افسوس کہ امام ابنِ تیمیہؒ اور قاضی شوکانیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

[illegible] سرخسیؒ مزید ایک استدلال پیش کرتے ہیں کہ تین طلاقیں دینا مرد کا وہ حق ہے جسے [illegible] کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے [illegible] رکھے چاہے طلاق کے ذریعہ ختم کر دے۔

[illegible] تین طلاقیں مرد کی ملکیت ہوئیں تو اپنی ملکیت میں اس کا تصرّف نافذ ہو جائے گا چاہے وہ [illegible] ہی کیوں نہ ہو۔ زید مسلمان ہو کر بھی شراب کی بوتل یا سینما کا ٹکٹ خریدتا ہے لیکن بیع [illegible] جاتی ہے۔

[illegible] سرخسیؒ کے دلائل کو کوئی مانے یا نہ مانے یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہم دکھانا یہ چاہتے [illegible] کے خیالات زیرِ بحث مسئلہ میں کیا ہیں۔ آگے چل کر وہ طلاق کا باب قائم کر کے [illegible] صفحات لکھتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان میں وہ جو کچھ بھی لکھیں گے وہ اس مفہوم پر [illegible] نہیں سکتا کہ تین اکھٹی طلاقوں کے پڑنے میں کسی شبہ کی گنجائش ہے۔ پھر بھی مولانا [illegible] ان صفحات میں سے کچھ سطریں اٹھا کر اس طرح پیش کر دینا کہ گویا سرخسیؒ بھی موصوف [illegible] موقف و مسلک کی ہمنوائی کر رہے ہیں کس قسم کا عدل ہے۔ سرخسیؒ جو کچھ کہہ رہے ہیں [illegible] ہمارے دوست نے سمجھا نہیں تو اب سمجھ لیں ——— وہ ان حضرات کو جواب [illegible] ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اکٹھی تین دینا نہ بدعت ہے نہ گناہ اور اسی حدیثِ عُوَیمر سے [illegible] کرتے ہیں۔ سرخسیؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال درست نہیں..... [illegible] تو حضورؐ نے شفقت کی بنا پر ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ دوسرے اوقات میں تو [illegible] متعدد طریقوں سے ظاہر فرما ہی دیا ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں دینا گناہ کی بات ہے [illegible] جاتی ہیں۔

[illegible] گذر چکا ہے کہ تین کے واقع ہو جانے میں تو احناف و شوافع کا کوئی اختلاف نہیں [illegible] دینا فعلِ مباح ہے یا فعلِ گناہ اس میں اختلاف ہے۔ اب اگر آپ امام [illegible] کی تاویل کو اپنے اس خیال کی تائید میں لاتے ہیں کہ تین پڑتی ہی نہیں تو کیا یہ علمی [illegible] ہے۔ کوئی بھی قاری یہی سمجھے گا کہ اوہو یہ تو امام سرخسیؒ بھی مولانا حامد علی کی تائید [illegible] حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے خود اسی عبارت میں جو آپ نے مبسوط سے نقل کی وہ ٹکڑا [illegible] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تین طلاقوں کے واقع ہونے نہ ہونے کی بحث نہیں [illegible] کے مکروہ یا غیر مکروہ ہونے کی بحث ہے۔ تین کا واقع ہونا تو مسلّمات میں سے ہے۔

سرخسیؒ کا یہ منقولہ فقرہ (آپ ہی کے ترجمے کے مطابق۔)

"تین طلاقیں ایک ساتھ دینا اس لئے مکروہ ہے کہ
تلافی کا دروازہ بلا ضرورت بند ہوتا ہے۔"

ناطق ہے کہ سرخسیؒ کے نزدیک بھی اکٹھی تین طلاقیں پڑ ضرور جاتی ہیں۔ [illegible] دروازہ کہاں بند ہوتا۔ رجوع کا دروازہ بہرحال بند ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ طلاق [illegible] والے نے بلا ضرورت اسے بند کردیا اس لئے گناہ گار ہوا۔

مزید دیکھئے۔ اسی آپ کی منقولہ عبارت میں سرخسیؒ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ لعان [illegible] جب لعان پر مصر ہوں تو تلافی کا دروازہ آپ سے آپ بند ہوتا ہے لہٰذا عویمرؓ [illegible] طلاقیں اسے بند کرنے کی وجہ نہیں ہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے ٹوکا نہیں اور اسی لئے [illegible] درست نہیں کہ حضورؐ کی خاموشی تین طلاقوں کے خالی از کراہت ہونے پر دلالت [illegible] اس تقریرِ کلام سے کیا یہ واضح نہیں ہے کہ جب تلافی کا دروازہ کسی اور وجہ سے بند [illegible] کھلا ہوا ہو تو تین اکٹھی طلاقیں اسے بند کردیتی ہیں؟

اسی جگہ آپ نے علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی فیض الباری سے چند سطریں نقل کر [illegible] فرمایا کہ "موصوف کے اس جواب سے بہت سی متعلقہ احادیث کو صحیح طور پر سمجھا جا [illegible]

ہمیں افسوس ہے کہ یا تو آپ دوسروں کا کلام سمجھتے نہیں یا خدا نخواستہ جان بوجھ کر [illegible] نہیں چاہتے۔ جو حدیث خود آپ نے بخاری وغیرہ سے نقل کی اس میں یہ تو صراحۃً مو[illegible] لعان کے بعد عویمرؓ نے یہ بھی انتظار نہ کیا کہ حضورؐ کیا حکم فرماتے ہیں۔ اور ہاتھوں [illegible] تین طلاقیں دے ڈالیں۔ نیز آں جناب ہی لکھتے بھی ہیں کہ تمام مستند احادیث میں [illegible] مشترک ہے کہ عُوَیمرؓ نے حضورؐ کے سامنے ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں۔

گویا یہ سوال تو اب اٹھتا ہی نہیں کہ یہ تین طلاقیں مختلف وقتوں اور مختلف [illegible] دی گئی ہوں۔ لہٰذا جب علامہ انور شاہؒ یہ تاویل کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ عُوَیمر [illegible] طور پر تین دی ہوں تو اس کا واحد مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تین الگ الگ [illegible] دی ہوں۔ یعنی یوں نہ کہا ہو کہ تجھ پر تین طلاق بلکہ تین بار اس جملے کا اعادہ کیا ہو کہ [illegible] ہے" ـــــ اور راوی نے اسی صورتِ حال کو یوں بیان کردیا ہو کہ عُوَیمرؓ [illegible] طلاقیں دیں۔

فرمائیے آپ کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا۔ آپ تو کبھی مختلف مجلسوں کی شرط لگاتے ہیں [illegible] طریق سنّت یعنی ایک ایک ماہ بعد کی پابندی عائد کرتے ہیں حالانکہ علامہ موصوف کی [illegible] تاویل کا بھی کوئی تعلق مختلف مجلسوں سے نہیں ہے۔

[illegible] خود علامہ کشمیریؒ کو اس تاویل سے کیا فائدہ پہنچا یہ ہم سے سُنئے۔ معلوم ہی ہو چکا [illegible] کہ فقرے کو تین بار دہرانا کبھی محض تاکید کے لئے بھی ہوتا ہے اور نیت اگر ایک ہی کی ہو تو [illegible] ایک کا فیصلہ دیا جا سکتا ہے ـــــ رکانہؓ کے قصے میں آپ نے دیکھا کہ طلاق بتّہ دی [illegible] تھی حضورؐ نے قسم لے کر نیت کی وضاحت چاہی اور وضاحت کے مطابق فیصلہ دیا تو حضرت [illegible] شاہ صاحبؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عین ممکن ہے عویمرؓ نے "تین طلاق" کے الفاظ نہ کہے [illegible] ہوں بلکہ لفظِ طلاق یا پورا فقرہ تین بار کہہ گئے ہوں۔ جوش میں تو تھے ہی۔ اس قیاس کی [illegible] گنجائش موجود تھی کہ نیت تین کی نہ ہو، بس دل کا بخار نکال رہے ہوں۔ لہٰذا اسی گنجائش کا [illegible] لحاظ کر کے حضورؐ کچھ نہ بولے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ حضورؐ نے واقعی تین طلاق پر [illegible] سکوت فرمایا اور اس طرح تین میں کراہت نہ رہی۔

معلوم ہے کہ سرخسیؒ کی طرح علامہ انور شاہؒ بھی اسی کے قائل تھے کہ اکٹھی تین [illegible] طلاقیں پڑ جاتی ہیں مگر دینے والا گناہ گار ہوتا ہے۔ ان کی تقریر و تاویل اسی گناہ والے [illegible] پہلو سے متعلق تھی مگر آں جناب نے اس کا رُخ پھیر کر اپنے اس غلط خیال کی طرف [illegible] موڑ لیا کہ تین اکٹھی پڑتی ہی نہیں ہیں ہم نہیں سمجھتے کہ یہ تحقیق اور حق پرستی کی کون سی قسم ہے۔

سب سے اہم نکتہ جو اس حدیث میں موجود ہے اُسے آپ لوگ دیکھتے ہی نہیں۔ آپ تو بس اس این و آں میں پڑ گئے ہیں کہ لعان کے بعد عویمرؓ اور ان کی بیوی میں [illegible] جدائی ہوئی ہی تھی لہٰذا تین طلاقوں سے کچھ حاصل نہ ہوا اور ان سے حجت نہیں پکڑنی چاہیئے [illegible] لیکن یہ نہیں سوچتے کہ آخر عویمرؓ نے تین دیں ہی کیوں؟

آپ حضرات کا خیال بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقیں نہ صرف دورِ [illegible] رسالتؐ میں بلکہ دورِ صدیقیؓ میں بھی ایک ہی ہوا کرتی تھیں۔ یہ واقعہ دورِ رسالتؐ ہی کا ہے [illegible] عویمرؓ بھی اسی معاشرے میں رہ بس رہے ہیں جس میں آپ کا فرمانا ہے کہ ایک وقت میں [illegible] ایک ہی طلاق پڑا کرتی تھی چاہے کتنی ہی دے دو۔ تو عویمرؓ کیسے اور کہاں سے [illegible] اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ تین طلاقیں ایک طلاق سے زیادہ اثر رکھتی ہیں۔ پھر کیا ان پر کوئی

دورہ پڑا تھا کہ تین دے بیٹھے۔ دورے میں بھی صرف وہی باتیں ظاہر ہوا کرتی ہیں جو کبھی نہ کبھی تحت الشعور میں جاگزیں ہوگئی ہوں۔ آخر یہ بات عُوَیمرؓ کے تحت الشعور میں آئی کہاں سے کہ ایک کے بجائے تین کچھ زیادہ مفید اور زوردار رہیں گی؟

حق یہ ہے کہ عُوَیمرؓ کا تین طلاقیں دینا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی دانست میں ان تینوں کا وقوع ہو جاتا تھا۔ انتہائی غصّے اور خفگی کے عالم میں قدرتاً انھوں نے یہ چاہا کہ بیوی سے قطع تعلق کا اعلان کر دیں اور اس اعلان کے لئے تین طلاقوں کا عنوان اختیار فرمایا۔

اِجْمَاع

اجماع کا عنوان دے کر ہمارے دوست نے بڑے شدّ و مد سے دعویٰ کیا ہے کہ تین طلاق کے وقوع پر اجماع ہرگز نہیں۔ اجماع کا دعویٰ کرنے والے سہل انگار ہیں۔ اجماع کا کوئی ثبوت فی الواقع موجود نہیں وغیرہ۔ــــــ خطا معاف۔ یہ دراصل عدل نہیں تحکّم بول رہا ہے۔ آگے ان شاء اللہ! اجماع کی بحث میں ہم دکھائیں گے کہ ہمارے دوستوں کو پرواہ ہی نہیں کہ اصطلاحِ فن میں اجماع کسے کہتے ہیں اور اس مسلّم اجماع کا انکار جس نے بھی کیا ہے اپنی جراٗتِ بے جا کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں ہم ایک اور نمونہ ایسا پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلاف کی تحریروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا۔

بخاری میں ایک باب ہے باب من اجاز الطلاق الثلاث (یا۔ من جوّز ... اس کا تذکرہ پیچھے بھی آچکا ہے) اس کے بارے میں ہمارے دوست نے لکھا ہی کہ علامہ ابن حجرؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

> "اور ترجمۃ الباب میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ
> سلف میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تین طلاق کے وقوع کو
> جائز قرار نہیں دیتے۔"

ہمیں انکار نہیں کہ ابنِ حجرؒ کا جو فقرہ نقل کیا گیا اس کا یہ ترجمہ درست ہے لیکن اہلِ علم فتح الباری کھول کر دیکھیں کیا آگے پیچھے کی عبارت پڑھ کر بھی کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ

ابن حجرؒ کے نزدیک بخاری کے عنوان باب کی واقعی یہی تشریح ہے!ــــــ موجودہ صورت میں ہر شخص ہمارے دوست کی تحریر سے یہی سمجھے گا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک سلف یعنی امام بخاریؒ سے پہلے ایسے لوگ موجود رہے ہیں جن کا مسلک یہ ہو کہ ایک وقت کی تین طلاقیں واقع نہیں ہوتیں۔ اور ابن حجرؒ بھی بخاریؒ کے اس خیال سے متفق ہیں۔ لیکن صحیح صورتحال کیا ہے یہ ہم سے سنیئے۔

اہل علم فتح الباری جلد ۹ ص۳۱۹ (یا جدید ترین ایڈیشن میں جلد۱۱) کھول لیں۔ ابن حجرؒ یہی فقرہ لکھ کر جسے ہمارے دوست نے "تشریح" کی حیثیت سے نقل کر دیا ہے۔ــــــ رقم طراز ہیں کہ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ امام بخاریؒ کا مطلب یہ ہو کہ سلف میں جو حضرات تین طلاقیں واقع کرنے کو ناجائز کہتے ہیں وہ اس معنیٰ میں ناجائز کہتے ہیں کہ چاہیے ایک وقت میں دو چاہے طریقِ سُنّت سے ایک ایک ماہ بعد دو ہر حال میں گناہ کی بات ہے۔ ایسا کہنے کے لئے ممکن ہے وہ اس حدیث سے حجّت پکڑتے ہوں کہ حلال چیزوں میں سب سے نامرغوب چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ لہٰذا ایک ہی طلاق جب قطع تعلق کو کافی ہو سکتی ہے تو کیوں ایک سے زائد دے کر مبغوض چیز میں اضافہ کیا۔ ایک دے کر رجوع مت کرو۔ عدت گزرنے پر قصّہ ختم۔ چنانچہ بحثِ طلاق کے شروع میں ابن حجرؒ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ سندِ صحیح سے حدیث بیان ہوئی ہے کہ کوئی ایسا شخص عمر فاروقؓ کے سامنے لایا جاتا جس نے اکٹھی تین طلاقیں دی ہوں تو وہ اس کے کوڑے رسید کرتے۔

دیکھا آپ نے۔ ابنِ حجرؒ نے اپنے تشریحی فقرے کا ایک ممکن مطلب تو یہ بتایا۔ اس سے تو وہ بات ہی بدل گئی جو ہمارے دوست کی مصلحت آمیز اختصار پسندی سے پیدا ہوئی تھی۔ یعنی وقوعِ طلاق کو ناجائز قرار دینے کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ تین طلاقیں واقع ہی نہیں ہوتیں۔ یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ طلاقِ سنّت کو بھی یہ حضرات ناجائز کہہ رہے ہیں تین ماہ کی تین طلاقیں تو بلا اختلاف واقع ہو ہی جاتی ہیں۔ اگر یہ بھی ان کے نزدیک ناجائز ہیں تو اکٹھی تین بھی اسی مفہوم میں ناجائز ہوئیں کہ واقع تو ہو گئیں لیکن دینے والا گناہ گار ہوا۔

ابنِ حجرؒ کی اس پہلی توجیہ کے لحاظ سے امام بخاریؒ کے عنوانِ باب کا مطلب یہ نہ ہوا کہ وہ واقع ہو جانے اور نہ ہو جانے کے اختلاف کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔

دوسری توجیہ ابنِ حجرؒ نے یہ فرمائی کہ ممکن ہے وقوع کو ناجائز ماننے کا مطلب یہ ہو کہ

تین اکٹھی طلاقیں دی جائیں تو ایک بھی نہیں پڑتی۔ کیوں کہ تین اکٹھی دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہی قول ہے شیعوں کا اور بعض اہلِ ظاہر کا۔ ان میں سے بعض تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ حیض میں بھی طلاق نہیں پڑتی کیوں کہ اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

بس۔ عنوانِ باب کی شرح ابنِ حجرؒ نے ختم کردی۔ ——— فرمایا جائے انکے واضح فرمودہ دو ممکن احتمالات میں کون سا احتمال ہے جس سے ہمارے دوست کا مقالہ روشناس کرا رہا ہے۔ ہمارے دوست نہ تو پہلی بات کے قائل ہیں کہ تین طلاق سُنّۃً بھی ناجائز ہوں اور نہ پڑیں نہ دوسری کے قائل ہیں کہ تین دو تو ایک بھی نہ پڑے۔ پھر کیا ان کی نقل کا حاصل یہی نہیں ہوا کہ جو کچھ حقیقۃً ابنِ حجرؒ نے کہا تھا اس کی تو ہوا تک قاری کو نہ ملی اور جو نہیں کہا تھا وہ ان کی قطع و بُرید نے باور کرا دیا۔

اس کے بعد ہمارے دوست نے تقریباً سترہؔ سطریں ابنِ حجرؒ کی اور نقل کی ہیں مگر انھیں بھی وہ نہیں سمجھے یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ ہم اس بات کو ثابت کریں تو پوری عربی عبارت نقل کر کے طویل گفتگو کرنی ہوگی۔ لہٰذا نظرانداز کر کے بس اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ ہمارے دوست اگر تلاشِ حق کے تقاضوں کو سمجھتے تو اتنا ضرور کرتے کہ ابن حجرؒ نے شیعوں کے استدلال کی وضاحت میں حضرت علیؓ، حضرت ابنِ مسعود، حضرت ابنِ عوف اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابیوں کے جو نام گنوائے ہیں ان پر اپنے سوئے ہوئے دماغ کو جھنجھوڑ کر جگاتے اور سوچتے کہ اگر واقعی یہ صحابیؓ تین طلاق کے ایک ہونے کا فتویٰ دے چکے ہوں تو ساری امتِ محمدیہؐ اور جمہور فقہاء کیا بالکل ہی بد دین اور عقل باختہ ہیں کہ اجماع کی رَٹ لگائے جا رہے ہیں۔ ابنِ حجرؒ نے تو اس کتاب اور اس کے مصنف کا نام بھی دے دیا ہے جس میں ان صحابہؓ کی طرف اس مسلک اور فتوے کی نسبت کی گئی ہے۔ اگر ہمارے دوست اس کتاب (الوثائق) تک پہنچ جاتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ سب بے سند باتیں ہیں۔ واہی اور افسانوی۔

کلام فہمی کا ایک دلچسپ نمونہ

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اکھٹی تین طلاقوں کا تین ہونا اجماعی مسلک نہیں ہے بلکہ شروع ہی سے اس میں اختلاف چلا آرہا ہے۔ ہمارے دوست امام طحاویؒ کی ایک

عبارت مع ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ ان کا دیا ہوا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو عورت پر ایک ہی واقع ہوگی جب کہ وقتِ سنّت میں یعنی اس وقت دی گئی ہو کہ وہ پاک ہو اور اس سے جماع نہ کیا گیا ہو، اور انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"واضح رہے کہ امام طحاویؒ امام ابنِ تیمیہؒ سے بہت پہلے کے محدّث ہیں۔ وہ امام بخاریؒ کے معاصر ہیں۔ گویا امام طحاویؒ کے زمانے تک بھی اس مسلک کے قائل اتنے لوگ تھے کہ انھیں قوم (گروہ) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔"

اب ذرا ہمارے دوست غور کریں کہ کیا امام طحاویؒ نے مذکورہ عبارت میں کسی ایسے گروہ کا ذکر کیا ہے جو یہ کہتا ہو کہ اکھٹی تین طلاقیں تین نہیں ہوتیں ایک ہوتی ہیں۔ یا ایسے گروہ کا ذکر کیا ہے جو تین کو ایک بھی اس وقت مانتا ہے جب یہ طلاقیں اس طہر کے زمانے میں دی گئی ہوں جس میں بیوی سے مجامعت نہ کی گئی ہو۔ گویا حالتِ حیض میں یا اس طُہر میں جسمیں مجامعت کی جا چکی ہو تین طلاقیں دی گئیں تو اس گروہ کے نزدیک ایک بھی نہ پڑے گی۔ فرمایئے کیا یہ مسلک اہلِ سنّت کے کسی گروہ کا ہے یا شیعوں کے فرقۂ امامیہ کا؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حیض میں یا اس طہر میں جس میں صحبت کرلی گئی ہو تین طلاقیں دی جائیں تو اہلِ سُنّت کا کوئی گروہ ——— نہ خود آنجناب یہ کہتے ہیں کہ ایک بھی نہیں پڑے گی۔ آپ کا اور جملہ مقالہ نگاروں کا مسلک یہ ہے کہ ایک پڑے گی۔ پھر اس میں کیا شبہ رہا کہ امام طحاویؒ جس گروہ کا مجمل ذکر کر رہے ہیں وہ فرقۂ امامیہ ہے۔ اور جب اس میں شبہ نہ رہا تو طحاویؒ کی عبارت سے آپ کا یہ استدلال کیسے روا ہے کہ اس سے کسی ایسے گروہ اہلِ سنّت کی نشاندہی ہوگئی جو تین کو تین نہیں مانتا۔ جہاں تک گروہوں کا تعلق ہے امام طحاویؒ سے بہت پہلے عین حضرت علیؓ کے دور میں ایسے بھی گروہ پائے جاتے تھے جو حضرت علیؓ کو نعوذ باللہ کافر کہتے تھے اور ایسے بھی گروہ پائے جاتے تھے جو اسکے برعکس حضرت علیؓ کو خلیفۂ اوّل قائم بالحق وغیرہ کہہ کر دعویٰ کرتے تھے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ غاصب ہیں۔ انھوں نے حضرت علیؓ کی حق تلفی کر کے خلافت پر ظلماً قبضہ کرلیا۔ تو کیا ان گروہوں کے وجود کا حوالہ دے کر اب آپ ہم سے یہ بھی کہیں گے کہ حضرت علیؓ کا مسلمان ہونا اجماعی

نہیں ہے اور ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلفائے برحق ماننا بھی اجماعی نہیں ہے۔

گستاخی معاف! اگر سخن فہمی کا یہی عالم ہو تو کیا فائدہ اس سے کہ طحاویؒ یا ابن قیمؒ یا ابن حجرؒ کی طویل بحثوں میں سر مارا جائے۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر ہمارے دوست وہ خلاصۂ بحث ملاحظہ فرما لیتے جسے حافظ ابنِ حجرؒ نے خود ہی بہ الفاظِ ذیل حوالۂ قلم کر دیا ہے:۔

وایقاع الثلث للاجماع الذی انعقد فی عهد عمر علیٰ ذلك ولا یحفظ ان احدا فی عهده خالفه۔

تین اکٹھی طلاقوں کے وقوع پر حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اجماع منعقد ہے اور کسی کو یاد نہیں کہ ان کے زمانے میں کسی فردِ واحد نے بھی اس کی مخالفت کی ہو۔

(چند فقروں کے بعد:۔

فالمخالف بعد هذا الاجماع منا بذ له والجمهور علیٰ عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۹۹)

پس اس اجماع کے بعد اس کی مخالفت کرنے والا اجماع سے منحرف ہے اور جمہورِ اُمّت کسی مسئلے پر پورا اتفاق واقع ہو جانے کے بعد ان لوگوں کا قطعاً اعتبار نہیں کرتے جو اس میں اختلاف کریں۔

علامہ عینیؒ شارح بخاریؒ بھی اسی کے قریب قریب فرماتے ہیں:۔

"جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی نے بیوی کو تین طلاقیں دیں تو تین پڑ گئیں لیکن وہ گناہ گار بھی ہوا اور جمہور علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ جس نے تین کے وقوع میں اختلاف کیا اس کا اختلاف شاذ ہے، مخالف ہے اہلِ سُنّت کا۔ اس کا تعلق اہلِ بدعت سے ہے اور ایسے لوگوں سے ہے جنھیں اس بنا پر قابلِ التفات نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ اُس جماعت سے کٹ گئے ہیں۔ جس کا قرآن و سنّت کی تحریف پر متفق ہو جانا قابلِ فہم نہیں۔"

دسوقیؒ نے ابن عبد البرؒ سے بھی تین پڑ جانے پر اجماع نقل کیا ہے۔

(اوجز المسالک ج ۴ ص ۳۳۱)

خود رائی

ہمارے دوست آخر میں لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک میرے نقطۂ نظر کا تعلق ہے آدمی تین طلاق دے یا ہزار، اس سے

طلاق مغلظہ بائنہ نہیں پڑے گی صرف ایک طلاق پڑے گی خواہ وہ تین یا ہزار دینے کی نیت کرے یا اس کا مقصود صرف طلاق دینا ہو۔"

یعنی ان کے نزدیک ایک وقت میں تین طلاق پڑنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ آیئے ایک روایت اور دیکھیں تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ ہمارے دوست کے خیال کی علمی قدر و قیمت کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں امام مالکؒ صرف ایک واسطے سے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کا قول نقل کرتے ہیں:۔

مالك عن نافع عن ابن عمرؓ۔ امام مالکؒ حضرت نافعؒ سے اور حضرت نافعؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا۔

کیا نقل کیا یہ سننے سے پہلے گوش گزار کر لیجئے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک دنیا کی تمام سندوں میں یہ صحیح ترین سند ہے اور تمام اساتذہ و ماہرین اس سند کو اعلیٰ ترین سندوں کی صف میں رکھتے ہیں۔

كان يقول فی الخلية والبرية انها تطليقات ثلث كل واحد منهما (م ن ۱۴۵)

ابن عمر خلیۃ والبریۃ کے معاملہ میں فرماتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک تین طلاقوں کے مرادف ہے۔

یعنی کسی شخص نے بیوی سے یوں کہا کہ میں تجھ سے بری ہوں یا بیزار ہوں یا بے تعلق ہوں تو اس طرح کا ہر لفظ تین طلاقیں ڈال دیتا ہے۔

بے شک یہ ابنِ عمرؓ کی ذاتی رائے ہے اس لئے اسے ماننا ضروری نہیں اور تاویل کے بغیر مانا بھی نہیں گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ بہر حال ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک وقت میں تین طلاقیں پڑ جانا کوئی ایسی بات نہیں تھی جو نئی ہو اور دورِ رسالتؐ میں نہ پائی جاتی ہو۔ اب گویا بحث ان کی رائے کی نہیں بلکہ خبر کی ہے۔ خبر دینے میں تمام صحابہؓ بالاتفاق عدول مانے گئے ہیں۔ اگر ابنِ عمرؓ کے کلام کا بین السطور یہ خبر دے رہا ہے کہ دورِ رسالتؐ میں کچھ نہ کچھ شکلیں ایسی ضرور تھیں جن میں بیک وقت طلاقِ مغلظ واقع ہو جاتی تھی تو ابن قیمؒ اور ابنِ تیمیہؒ وغیرہ کے علمِ کلام کی وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر وہ اپنے مسلک کی عمارت اٹھائے ہوئے ہیں۔ جو کچھ مولانا حامد علی نے کہا اس کا تو مطلب یہ ہے کہ تین طلاقیں کسی بھی طرح ایک وقت میں پڑ ہی نہیں سکتیں۔ یہ دراصل

معارضہ ہے اس خبر کے جو ابن عمرؓ دے رہے ہیں۔ صحابیؓ کی خبر سے معارضہ اسے جھٹلانے کے مرادف ہے اور صحابی کو جھٹلانا علم الحدیث کے پورے ایوان کو زمین بوس کر دیتا ہے یہ مجال کسی کی نہیں کہ مالك عن نافع عن ابن عمر کی اسناد میں فی نکال سکے۔ گویا ابن عمرؓ کا ارشاد کی صحتِ نقل شبہ سے بالاتر ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے دوست نے صـ۱۴۹ پر علامہ عینیؒ کی ایک عبارت عمدۃ القاری سے نقل کی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام نخعیؒ بھی اکٹھی تین طلاقوں کو ایک مانتے تھے ہم انھیں تو قصوروار نہیں کہیں گے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ اگر وہ مطالعہ کو وسعت دیتے تو بہ آسانی اندازہ کر سکتے تھے کہ عمدۃ القاری میں طباعتی غلطی واقع ہوئی ہے۔ صحیح عبارت یوں تھی۔ والحجاج بن ارطاۃ النخعی۔ یعنی ابراہیم نخعی کا ذکر نہیں تھا بلکہ ارطاۃ نخعی کا ذکر تھا۔ معلوم نہیں کب کس طرح ارطاۃؒ کے بعد واو کا اضافہ ہو گیا اور بات یہ بن گئی کہ نخعی گویا مستقل شخص ہیں اور ارطاۃؒ دوسرے کوئی شخص۔

ہمارے دعوے کا ایک ثبوت تو اسی عمدۃ القاری کی جلد ۹ صـ۵۳۷ پر موجود ہے کہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:۔

"تابعین کے جمہور علماء اور ان کے بعد کے جمہور علماء جن میں امام اوزاعیؒ۔ امام نخعیؒ۔ امام ثوریؒ۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب امام احمدؒ اور ان کے اصحاب اور اسحٰقؒ اور ابو الثورؒ اور ابو عبیدہؒ۔ اور دوسرے کثیر علماء شامل ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ جس نے بیوی کو تین طلاقیں دیں واقع ہو جائیں گی البتہ وہ گناہ گار بھی ہو گا۔

دیکھ لیجیے کیا اس میں امام نخعیؒ کا نام موجود نہیں۔

دوسرا ثبوت مصنف عبدالرزاق ہے جس میں امام نخعیؒ کا مذہب تین واقع ہو جانے کا بیان کیا گیا ہے۔

مزید ثبوت فقہِ حنفی کی وہ بے شمار کتابیں ہیں جن میں یہی تصریح محفوظ و موجود ہے۔ اندازہ کر لیجیے کس طرح غلط فہمیاں پھیلتی اور پھیلائی جاتی ہیں۔[1]

[1] محمد بن حسنؒ کی کتاب الآثار میں امام نخعیؒ کا صریح فتویٰ موجود ہے کہ اعتبار طلاق میں زبان کا ہے نیت کا نہیں

بنیادی بات

اتنا تو اندازہ بہرحال قارئین کر چکے کہ مقالہ نگاروں کے دلائل کا کیا حال ہے اور یہ دلائل چونکہ اکثر و بیشتر ابن قیمؒ ہی سے مستعار لیے ہوئے ہیں اس لئے خود ابن قیمؒ کے موقف کے ضعف و قوت کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی گیا۔ اصل بات جو اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے یہ ہے کہ جمہورِ اُمت کے پاس تو اپنے مسلک کے لئے سات آٹھ ایسی حدیثیں ہیں جنہیں سے بعض صحیح اور بعض حسن ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے صحابیوںؓ کے واضح فتاوی ہیں ان کے خلاف کسی ایک بھی صحابیؓ کا فتویٰ نہیں۔ مزید یہ کہ چاروں معروف و مقبول ائمہؒ کا اتفاقِ رائے ہے اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے بے شمار فتوے ہیں۔

مگر فریقِ ثانی کے پاس صرف دو روایتیں ہیں اور چند ایسے لوگوں کے نام جنکا کوئی مقابلہ صحابہؓ سے تو کیا ائمہؒ و مجتہدین سے بھی نہیں ہے۔ ان دو روایتوں کا حال یہ ہے کہ انہیں اگر بلا بحث و نظر تسلیم بھی کر لیا جائے تو مفہوم کے اعتبار سے یہ ان کے موقف کی تائید نہیں کرتیں بلکہ جمہورِ امت کے حق میں بھی ان سے استدلال ممکن ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے ان روایتوں کا جو حال ہے اس کی وضاحت و تنقیح بڑے بڑے ماہرینِ فن کر چکے ہیں اور اس کی روشنی میں ان سے استدلال صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یہ طے کر چکے ہوں کہ ہم دوسروں کی بات نہیں سنیں گے بس اپنی کہے جائیں گے۔ ہم پچھلے صفحات میں ان پر خاصی گفتگو کر آئے ہیں۔ مقالات کی حد تک تو یہ گفتگو کسی اضافے کی محتاج نہیں لیکن علم و تحقیق کا تقاضا ہے کہ کچھ ضروری معلومات طالبانِ حق کے آگے اور بھی آ جائیں۔

حدیثِ رکانہؓ کا وہ متن جو مسند احمد میں آیا ہے اور جسے محترم مولانا اکبر آبادی نے نقل کیا ہے ظاہراً دلیلِ قوی ہے اس بات کی کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں حضورؐ نے ایک ہی شمار کی تھیں مگر ہم واضح کر آئے کہ یہ متن ماہرینِ فن کے نزدیک درست نہیں بلکہ دوسرا متن درست ہے جسے دوسرے بہت سے محدثین نقل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی اشارہ کر آئے کہ خود امام احمدؒ کے نزدیک بھی یہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ ورق اُلٹ کر ایک بار پھر اس مقام پر نظر ڈالی جائے۔ اب ہم مزید تنقیحات حوالۂ قلم کرتے ہیں... تاکہ

بعض ان باتوں کا بھی جواب ہو جائے جو ابنِ قیمؒ کے مضامین میں موجود ہیں۔ اور [illegible]
ثانی وقتاً فوقتاً ان سے کمک حاصل کرتا رہتا ہے۔

مُسندَ احمد

عام قارئین کے لئے یہ بات الجھن کی ہوگی کہ جب امام احمدؒ خود اس حدیث کو درست
نہیں سمجھتے تھے تو آخر اپنی مسند میں اسے درج کیوں کیا۔ اس کا جواب وہ بغور سنیں۔
مسند احمد ایک ایسی کتاب ہے جو تنہا امام احمدؒ کی مکمل کردہ نہیں بلکہ وہ ا[illegible]
اوراق غیر مرتب اور غیر مہذّت شکل میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ا[illegible]
بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے اس میں کچھ اضافے کئے اور ان کے بعد ان کے شاگ[illegible]
ابوبکر القطیعیؒ نے۔ ترتیب و تہذیب بھی ان ہی حضرات کی رہینِ منّت ہے۔
حافظ ابنِ تیمیہؒ اپنی منہاج السُّنّۃ میں وضاحت کرتے ہیں کہ مسند احمدؒ میں امام [illegible]
اپنی جمع کردہ جتنی روایات ہیں وہ بھی سب کی سب ان کے نزدیک قابلِ احتجاج اور صحی[illegible]
نہیں ہیں کیوں کہ انھوں نے جو کچھ التزام کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایسے کسی راوی کی [illegible]
نہ لیں جو جھوٹ بولنے میں مشہور رہو۔ باقی ہر طرح کے راوی انھوں نے قبول کر لئے ہیں۔
خواہ وہ کتنے ہی ضعیف ہوں۔ وہ ہر وہ روایت نقل کر دیتے ہیں جو ان کے زمانے میں
اہلِ علم کے درمیان چل رہی ہو۔ (اجوبۂ فاضلہ بحوالہ منہاج السُّنّۃ)
چنانچہ اساتذۂ فن میں کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مسند احمد صرف صحیح احادیث کا
مجموعہ ہے بلکہ خاصی مقدار میں ضعیف احادیث کا وجود اس میں مسلّم ہے۔
صحیح مسلم کے شہرۂ آفاق شارح اور استاذِ فن امام نوویؒ اسی لئے تنبیہ کرتے ہیں کہ احتجا[illegible]
استدلال میں مسند احمد کا درجہ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی جیسا بھی نہیں (ملاحظہ ہو تدریب الراوی)
محتاط اندازہ یہ ہے کہ ضعیف احادیث کی تعداد مسند احمد میں آٹھ سو سے کم نہیں ہے۔
ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت امام احمدؒ کو آخرِ عمر میں اپنے جمع کردہ مواد کی تہذیب، تنقیح
اور ترتیب کا موقع ملتا تو وہ خود بھی نہ جانے کتنا حذف و اضافہ کرتے۔ کسی بھی تصنیف کے لئے
ایک مصنّف عرصۂ دراز تک جو مواد جمع کرتا رہتا ہے وہ سب کا سب ایسا نہیں ہوتا جس پر جمع کرتے وقت
بہت زیادہ غور و فکر کیا گیا ہو۔ غور و فکر بعد میں ہوتا ہے جب اسے تصنیفی شکل دی جاتی ہے۔

[illegible] جب مسلّمات میں سے ہے کہ امام احمدؒ طلاقِ مجموع کے وقوع کا وہی مسلک رکھتے تھے
[illegible] جمہورِ اُمّت کا ہے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اگر مسند احمد کے مواد کی ترتیب و تدوین کا
موقع انھیں مل جاتا تو اس میں یہ رُکانہؓ والی روایت نظر نہ آتی۔ ورق اُلٹ کر دیکھئے۔ مولانا
[illegible]س پیرزادہ اور مولانا حامد علی کے مقالات سے ہم امام احمدؒ کی یہ رائے نقل کر آئے ہیں
کہ حدیثِ رُکانہؓ کوئی چیز نہیں۔" اس رائے کو ابنِ قیمؒ ہی نے اغاثۃُ اللّہفان میں ذکر کیا
ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ امام
احمدؒ پر بھی ظلم ہی ڈھاتے ہیں۔

تنقیح

حدیثِ رُکانہؓ کا بغلی عنوان دے کر اس پر اتنی گفتگو ہم پیچھے کر آئے ہیں جتنی اس مقام
کے لئے کافی تھی، لیکن اس حدیث پر مولانا پیرزادہ نے بھی اور مولانا حامد علی نے بھی ابنِ قیمؒ کے
حوالے سے کچھ باتیں کہی ہیں۔ یہ باتیں علمی اعتبار سے کیا پایہ رکھتی ہیں اور خود ابنِ قیمؒ نے اس
مقام پر کیا غلطیاں کی ہیں اس کی کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بحث کو سمجھنے کے لئے۔۔
درج ذیل تفصیلات تازہ کر لی جائیں۔
رکانہؓ ایک صحابی ہیں جو اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں۔ پھر حضورؐ رجعت کی اجازت
مرحمت فرما دیتے ہیں۔ اس واقعہ کو متعدد حضرات نقل کرتے ہیں اور نقل در نقل ہوتا یہ امام
احمدؒ، بخاریؒ، ابوداؤدؒ اور دیگر محدّثینؒ تک پہنچتا ہے۔ اگر تمام راویوں نے ایک ہی بات
نقل کی ہوتی تو صاف معلوم ہو جاتا کہ رُکانہؓ نے کتنی طلاقیں دی تھیں اور کس طرح کن الفاظ
میں دی تھیں۔ لیکن متعدد راوی متعدد الفاظ اور مختلف مضمون نقل کرتے ہیں۔ اس لئے یہ
بات بحث طلب بن جاتی ہے کہ واقعۃً کتنی طلاقیں اور کن لفظوں میں دی تھیں جنھیں حضورؐ نے
طلاقِ رجعی مان لیا۔
ذیلاً یہ مختلف روایتیں پچھلے اوراق میں گذر چکی ہیں مگر سہولتِ فہم کے لئے یہاں
بھی انھیں دہرا لیجئے۔
(۱) ایک روایت مسند احمد کی ہے جس میں کہا گیا ہے اِنَّ رُکَانَۃَ طَلَّقَ امْرَاَتَہٗ ثَلٰثًا (رکانہ نے بیوی
کو تین طلاقیں دی تھیں) اور یہ بھی وضاحت ہے کہ ایک ہی مجلس میں دیں۔

(۲) دوسری وہ روایت ہے جسے ابن جُریجؒ کے حوالہ سے ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔ ا
اس میں تین ہی طلاقوں کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں طلاق دینے والا بجائے رُکانہؓ کے ا
باپ عبدیزید کو بتایا گیا ہے۔ گویا رکانہؓ کی ماں کو رکانہؓ کے باپ نے طلاق دی تھی۔
یعنی رُکانہؓ کی ماں حضورؐ کی خدمت میں فریاد لے کر آئیں اور حضورؐ نے عبدیزید کو حکم دیا کہ ا
بیوی سے رجوع کرلو۔

(۳) تیسری روایت وہ ہے جسے ابوداؤدؒ نے اس دوسری روایت کے بعد ذکر کیا۔
یعنی یہ کہ طلاق دینے والے رُکانہؓ کے باپ نہیں خود رُکانہؓ تھے اور انھوں نے تین طلا
نہیں بلکہ طلاق بتّہ دی تھی۔ یہیں ابوداؤدؒ یہ بھی تنبیہ کر گئے ہیں کہ قابلِ اعتماد یہی بتّہ والی روایت ہے
کیوں کہ اسے رُکانہؓ کے گھر والوں نے روایت کیا ہے جو باہر والوں سے زیادہ بہتر جا
سکتے تھے کہ گھر کے اندر کیا واقعہ کس طرح پیش آیا۔

بتّہ کی تفصیل وتشریح کے لئے قارئین ایک بار پھر پچھلے اوراق اُلٹ کر دیکھ لیں
یہی بتّہ والی روایت حدیث کی چھ سات کتابوں میں نقل ہوئی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے
چار کتابوں کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

اب ہم اس پر دو رُخ سے بحث کریں گے:۔

ایک یہ کہ امام بخاریؒ اور حافظ منذریؒ اور جن معدودے چند حضرات نے اس
حدیث کے مضطرب ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان سے چوک ہوئی ہے۔ حدیث
مضطرب نہیں[1] ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر مضطرب مان بھی لیں تو اس کا حاصل وہ نہیں ہوگا جو حا
ابن قیمؒ نے سمجھا اور ان کی تقلید میں بعض اور حضرات سمجھ رہے ہیں یعنی یہ کہ بتّہ والی
روایت تو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دو اور ثلٰث والی روایت سے حجّت پکڑنے لگو
اس کے برخلاف حاصل یہ ہوگا کہ اس واقعے کی تمام روایتیں ایک طرف رکھدی جائیں
اور کوئی بھی ان سے استدلال نہیں کر سکے گا۔

[1] یہاں کوئی صاحب ناک منھ نہ بنائیں کہ لیجئے میاں عامر بھی بخاریؒ ومنذریؒ جیسے اساطین کی فنّی خطائیں پکڑنے
لگے۔ عامر صرف ناقل ہے گرفت کرنے والے تو اصلاً وہ اساطین ہیں جو فن میں ان بزرگوں سے کم نہیں
عامر کو آپ جاہلِ مطلق بھی کہہ لیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پہلا رُخ

حدیثِ مضطرب کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ ایک ہی واقعے یا حکم کے بارے میں
تعدد راویوں سے ایسا ہی مختلف مضمون نقل ہوا ہو جیسا یہ رُکانہؓ کے واقعے میں نقل
ہوا ہے اور کوئی معقول وجہِ ترجیح ایسی موجود نہ ہو کہ ان میں سے کوئی ایک روایت صحیح
قرار دے کر باقی کو ضعیف قرار دے دیا جائے۔ اگر ایسی وجہِ ترجیح موجود ہوگی تو اضطرا
ختم ہو جائے گا۔ اور راجح روایت کو لے کر مرجوح روایات کو شاذ و مُنکر کے خانے میں
رکھ دیا جائے گا۔

نیز یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ اضطراب کبھی سندوں میں ہوتا ہے
کبھی متنوں میں۔ اساتذہ مثلاً علامہ الجزائریؒ جیسے حضرات وضاحت کرتے ہیں کہ
سندوں کے اضطراب کی تشخیص تو یقیناً محدّثین ہی کا منصب ہے کہ وہ سندوں کی لطیف
خامیوں اور علتوں کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن متون کے اضطراب کی تشخیص
فقہاء و مجتہدین کا منصب ہے کہ معانی و مطالب کے میدان کی شہسواری وہی کرتے ہیں۔

اس نکتے سے کوئی کتنا ہی جلے مگر بہر حال یہ ایک حقیقت ہے جس کا تلخ گھونٹ
غیر مقلد حضرات کو گلے سے اتارنا ہی پڑے گا۔ تاہم وہ پیشانی پر شکن نہ ڈالیں ہم طریقِ
محدّثین کو بھی اپنی بحث میں ملحوظ رکھیں گے۔ وَاللّٰہُ المعین۔

مُسندِ احمد والی روایت

اس روایت کی سند یہ ہے کہ ابن اسحاقؒ، داؤد بن الحصینؒ سے اور داؤد بن الحصینؒ
عکرمہؒ سے روایت کرتے ہیں۔

ابن اسحاقؒ کا حال یہ ہے کہ اسماء الرجال کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے اسمیں
ان کا ترجمہ کافی طویل ملے گا اور پتہ چلے گا کہ ایک طرف انھیں قابلِ اعتماد ماننے والے
بہت ہیں تو دوسری طرف انھیں ساقط الاعتبار بھی ماننے والے بہت ہیں۔ امام مالکؒ
جیسا شخص ان کے بارے میں کہتا ہے کہ ابن اسحاقؒ دجّالوں میں کا ایک دجّال ہے
اگر میں حجرِ اسود اور بابُ الکعبہ کے درمیان کھڑا ہو کر حلف کروں کہ وہ پرلے سرے کا جھوٹا

دجّال ہے تو میرا حلف جھوٹا نہ ہوگا۔ غرض ان کی شخصیّت شدید متکلم فیہ بن گئی ہے۔ اور حاصل کے طور پر اہلِ علم کے متعدد گروہ بن گئے ہیں۔ ایک وہ جو انھیں ثقہ سمجھتا ہے۔ دوسرا وہ جو انھیں صرف تاریخی واقعات کے بیان میں لائقِ اعتماد مانتا ہے مگر حدیث کے بارے میں نہیں۔ تیسرا وہ جو ان کی روایتوں کو صحیح تو مانتا ہے مگر حجت پکڑنے کے قابل نہیں سمجھتا جب تک کہ کوئی اور متابع اور شاہد موجود نہ ہو۔ امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ ان پر اس وقت بھی اعتبار ہوگا جب کہ ان کی روایت کا کوئی شاہد و متابع موجود نہ ہو لیکن اس وقت نہیں ہوگا جب ان کی روایت کے خلاف کوئی روایت موجود ہو۔ یہ سب حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری میں جمع کر دیا ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ مسند احمد والی روایت خود امام احمدؒ کے معیار سے ساقط الاعتبار ہو گئی۔ اس روایت میں محمد بن اسحاقؒ تین طلاقوں..... اور مجلسِ واحدہ کی بات کرتے ہیں جب کہ دوسری روایات بتّہ کی موجود ہیں، اور مجلس کا ان میں مطلق ذکر نہیں۔ نیز ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ طلاق ایک ہی دی گئی تھی نہ کہ تین۔

بہر حال یہ تو ماننا پڑے گا کہ جب ابنِ اسحاقؒ کی ثقاہت پر اتفاق نہیں ہے تو ان کی روایات سب کے لئے حجت نہیں ہو سکتیں حالانکہ زیرِ بحث مسئلہ میں ایسی ہی حدیثوں سے استدلال منصفانہ ہو سکتا ہے جن پر جمہور امّت بھروسا کر سکیں۔

دوسرے راوی داؤد ابن الحصینؒ کے بارے میں ہم نقل ہی کر آئے ہیں کہ امام بخاریؒ کے استاد مدینیؒ اور بعض دیگر اساتذہ نے تنبیہ کی ہے کہ جب یہ عکرمہؓ سے روایت کریں تو ہوشیار رہنا۔ آنکھیں بند کر کے اعتماد نہ کر لینا۔ زیرِ بحث روایت میں آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ داؤدؒ، عکرمہؓ سے روایت کر رہے ہیں۔

مزید یہ کہ ہر سلیم الطبع غور کرے طلاق گھر کے اندر دی گئی۔ اس روایت کے راویوں میں کوئی نہیں جو رکانہؓ کے اہلِ بیت میں ہو۔ انھوں نے جو کچھ نقل کیا ہے اِدھر اُدھر سے سُن کر نقل کیا ہے۔ اگر خود رکانہؓ کے گھر والے صحیح صحیح واقعہ بیان نہ کرتے تب تو یہ تسلیم کیا جا سکتا تھا کہ ان کے گھر کے باہر والوں کو بھی ٹھیک ہی بات پہونچ گئی ہوگی۔ لیکن گھر والوں کی تصریح جب سامنے آگئی تو پھر کیا گنجائش رہی کہ اسے نظر انداز کیا جائے اور اس بیان کو درست سمجھا جائے جو اس سے مختلف ہو۔

ان وجوہ سے یہ مسند احمد والی روایت ذرا بھی لائقِ اعتبار نہیں ہے۔ اور اسی لئے

اور امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

ابنِ جُریجؒ والی روایت

اسے ہم نمبر۲ پر بیان کر آئے۔ اس میں ایک کمزوری تو وہی ہے جس کی ابوداؤدؒ نے نشاندہی کی ہے کہ روایت کرنے والے اہلِ خانہ نہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ بجائے رکانہؓ کے ان کے باپ عبد یزید کو صاحبِ واقعہ بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ عبد یزید نے اسلام کا زمانہ ہی نہیں پایا اور جملہ روایات وضاحت کرتی ہیں کہ واقعہ رکانہؓ کا ہے نہ کہ کسی اور کا۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ ابنِ جریجؒ کسی متعیّن راوی کا نام نہیں لیتے بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ مجھے بعض بنی ابی رافع نے خبر دی۔

ان نمایاں خامیوں کی بنا پر یہ روایت کسی بھی درجے میں لائقِ اعتبار نہ رہی۔ حتّٰی کہ امام ابنِ قیمؒ بھی اسے کم سے کم ضعیف تو مانتے ہی ہیں۔ رہا وہ علمِ کلام جسے ابنِ قیمؒ سے مولانا حامد علی نے نقل کیا ہے تو وہ بھی بے نتیجہ ہی ہے۔

ذرا غور فرمائیے۔ ابوداؤدؒ یہ کہتے ہیں کہ بتّہ والی روایت ثلٰث والی روایت سے زیادہ صحیح ہے تو ابنِ قیمؒ اس پر یہ فرماتے ہیں کہ حدیثیں دونوں ضعیف ہیں۔ ابوداؤدؒ اگر ایک کو دوسری کے مقابلے میں زیادہ صحیح کہہ رہے ہیں تو ان کا منشا یہ نہیں کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے بلکہ منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسری ضعیف سے کچھ کم ضعیف ہے چلیے۔ مان لیا لیکن جب دوسرے قوی دلائل سے ثابت ہو رہا ہے کہ بتّہ والی روایت صحیح ہے اور باقی سب غلط تو پھر اس نکتہ سنجی سے کیا ملا۔

دو صریح غلطیاں جو یہاں امام قیمؒ نے کی ہیں انھیں بھی دیکھ لیجیے۔ مولانا حامد علی ان غلطیوں کا ادراک و احساس کئے بغیر بڑے شوق سے ابنِ قیمؒ کا استدلال نقل کر گئے اور یہ سمجھا کہ اس سے انھیں تقویت پہنچی، حالانکہ بات کچھ اور ہے۔ ہم براہ راست اغاثۃ اللہفان سے نقل کرنے کے بجائے مولانا حامد علی کے مقالے ہی سے وہی اردو ترجمہ نقل کر کے گفتگو کریں گے جو مولانا نے ابنِ قیمؒ کی عبارت کا کیا ہے۔

ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں:۔

”ابوداؤدؒ نے حدیثِ ابن جریجؒ پر حدیثِ البتّہ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ انھوں نے

ابنِ جریجؒ کی حدیث کو ایسی سند سے روایت کیا ہے جس میں ایک مجہول راوی ہے۔"
حیرت ہوتی ہے کہ ابن قیمؒ کے آگے ابوداؤد کھلی ہوئی ہے اور امام ابوداؤدؒ نے جو وجہ ترجیح بیان کی ہے وہ بھی ان کے سامنے ہے لیکن وہ اسے نظرانداز کرکے اپنی طرف سے ایک وجہ امام ابوداؤدؒ کی طرف منسوب کردیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر عمارت اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ ان کے مراتبِ اُخروی میں اضافہ فرمائے وہ تو جاچکے۔ ان کے علم کلام کو آنکھیں بند کرکے نقل کرنے والے حضرات ذرا ابوداؤد میں وجہِ ترجیح پر نظر ڈالیں۔ امام ابوداؤدؒ نے یہ ارشاد فرمایا:

"البتہ والی روایت ثلث والی روایت کے مقابلہ میں اس لئے قوی ہے کہ کسی شخص کا بیٹا اور اس کے گھر والے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ صحیح طور پر جان سکتے ہیں کہ طلاق کیسے کن لفظوں میں دی گئی (لانھم ولد الرّجل واھلہ اعلم بہ)۔"

گویا ابوداؤدؒ یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ چونکہ ابن جریجؒ نے ایک مجہول راوی سے روایت کیا ہے اس لئے ان کی روایت ساقط الاعتبار ہے بلکہ یوں کہہ رہے ہیں کہ گھر کے اندرونی واقعات اہلِ خانہ ہی زیادہ صحیح جان سکتے ہیں۔ کیا ان دونوں باتوں کا فرق کچھ اتنا دقیق ہے کہ ابنِ قیمؒ جیسے ذکی بھی نہ سمجھ سکے ہوں؟ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ابن جریجؒ بجائے کسی مجہول اور نا معلوم الاسم آدمی سے روایت کرنے کے معروف اور معلوم الاسم آدمی سے روایت کرتے ــــــــــ مثلاً یوں کہتے کہ مجھ سے طلحہ نے بیان کیا تب بھی ابوداؤدؒ کا استدلال اپنی جگہ قائم رہتا۔ روایت کو مرجوح قرار دینے کی وجہ راوی کا مجہول ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اہلِ خانہ میں سے نہیں ہے۔ کون صاحبِ انصاف ہے جو گھریلو نوعیت کے واقعات میں اس وجہِ ترجیح کو غلط قرار دے سکے۔ ابنِ قیمؒ پر چوں کہ اپنی قائم کردہ رائے کو صحیح ثابت کرنے کا جذباتی غلبہ ہوگیا تھا۔ اس لئے انھوں نے ابوداؤدؒ کی اصل وجہِ ترجیح کو نظرانداز کردیا۔ اسے نظرانداز کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اب وہ نہایت اطمینان سے یہ فرمارہے ہیں کہ جو روایت مسند احمد میں محمد اسحاق کی سند سے آئی ہے اس سے ابوداؤدؒ نے کوئی تعرض نہیں کیا نہ اپنی کتاب میں اسے بیان کیا۔ وہی ان دونوں روایتوں سے زیادہ صحیح ہے۔ ابنِ قیمؒ کا مطلب یہ ہے کہ دیکھ لو اس مسند احمد والی روایت میں تو کوئی راوی مجہول نہیں۔ اور امام ابوداؤدؒ چونکہ راوی کی مجہولیت ہی کی بنا پر ابن جریجؒ والی روایت

وج قرار دے رہے تھے لہٰذا ان کے نقطۂ نظر سے بھی یہ روایت زیادہ قوی ہے۔ حالانکہ
کہتے ہیں ابوداؤدؒ کا اس روایت سے تعرض نہ کرنا اور اسے اپنی کتاب میں نہ لینا صاف
اور پر اس لئے ہے کہ جو وجہ ناقابلِ اعتماد ہونے کی انھوں نے ابن جریجؒ والی روایت
کے لئے بیان کی وہی یہاں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی واقعہ بیان کرنے والے
گھر سے باہر کے لوگ ہیں اہلِ خانہ نہیں ہیں۔ جب اہلِ خانہ کی بیان کردہ قابلِ اطمینان
روایت مل گئی تو اب کیوں ابوداؤدؒ ان روایتوں کو قابلِ التفات سمجھیں جو غیر اہلِ خانہ نے
بیان کیں اور ان کی سند میں محمد بن اسحاقؒ جیسے متکلّم فیہ راوی بھی موجود ہیں۔

بات بڑی اہم ہے اس لئے ایک بار اسے ہم فنّی زبان میں بھی دہرائیں گے۔

امام ابوداؤدؒ ابن جریجؒ کی روایت کو معلول قرار دیتے ہیں۔ علّت یہ بیان فرماتے ہیں کہ
اس میں گھر سے باہر کے لوگوں نے جو واقعے کے وقت مقامِ واقعہ پر موجود نہیں تھے ایک
ایسا بیان دیا ہے جو واقعے کے وقت موجود گھر والوں کے بیان سے مختلف ہے۔ اعتبار
ان کا نہیں کیا جا سکتا جب کہ واقعہ گھریلو نوعیت کا ہے۔ معتبر گھر والے ہی ٹھہریں گے جو
بیان کرتے ہیں کہ رُکانہؓ نے طلاقِ بتّہ دی تھی۔

یہ علّت روایت کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لئے کافی معقول تھی۔ ابنِ قیّمؒ اُسے
رد نہیں کر سکے۔ اب مشکل یہ تھی کہ یہ علّت تو مسند احمد والی روایت میں بھی پائی جا رہی ہے۔
وہ بھی امام ابوداؤدؒ کے بجا اعتراض کے مطابق معلول ہی ہے۔ اس مشکل کا حل خدا جانے
کس طرح انھوں نے یہ نکالا کہ ابوداؤدؒ کی طرف اُس بات کی نسبت کر دی جو انھوں نے
نہیں بھی نہیں کہی یعنی یہ کہ ابوداؤدؒ ابن جریجؒ کی روایت کو اس لئے معلول قرار دے رہے ہیں
کہ اس میں ایک مجہول راوی ہے۔ اس غلط انتساب کے بعد ابن قیّمؒ کو یہ کہنے کا موقعہ
مل گیا کہ مسند احمد والی روایت ابوداؤدؒ کی دونوں روایتوں سے قوی ہے کیوں کہ اس میں
کوئی مجہول راوی ہے ہی نہیں۔ نیز انھیں یہ بھی کہنے کا موقع مل گیا کہ دیکھ لیجئے۔ امام ابوداؤدؒ
اس مسند احمد والی روایت سے تعرض نہیں کرتے۔ یعنی اسے وہ بھی معلول قرار نہیں دیتے
اب اہلِ علم انصاف فرمائیں کیا یہ منطق قابلِ تسلیم ہو سکتی ہے۔ کیا مسند احمد والی روایت بھی
ابوداؤدؒ کے نزدیک معلول قرار نہیں پائی جب کہ صریحاً اس میں بھی وہی علّت پائی جا رہی ہے
جو ابن جریجؒ والی روایت میں پائی جا رہی تھی۔ یعنی راوی کا اہلِ بیت میں سے نہ ہونا؟

ابن قیمؒ نے یہیں ایک اور بھی خطا کھائی ۔ یہ خطا مولانا حامد علی کی نقل کردہ عبارت ہی میں موجود ہے ۔ مسند احمد والی روایت کی کمزوری ابنِ قیمؒ کے علم میں تھی جس کا اعتراف بھی کہیں کہیں دبے الفاظ میں وہ کر گئے ہیں ۔ مثلاً اسی جگہ انھوں نے یہ تو کہدیا کہ مسند احمد کی روایت ابوداؤدؒ کی دونوں روایتوں سے زیادہ صحیح ہے لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکے کہ وہ فی نفسہٖ اصطلاحِ فن کے اعتبار سے بھی "صحیح" ہے ۔ ابوداؤدؒ کی دونوں روایتوں کو وہ ضعیف کہہ رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ابوداؤدؒ نے جب ان میں سے ایک روایت کو نسبتاً اصح (زیادہ صحیح) کہا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ انھوں نے اس پر صحیح کا حکم لگایا ۔ بس اتنا ثابت ہوا کہ دوسری ضعیف روایت کے مقابلے میں یہ کچھ کم ضعیف ہے ۔ تو اسی جگہ ابنِ قیمؒ کے قول کا بھی مطلب یہ نکلا کہ مسند احمد والی روایت میں ان دونوں روایتوں سے کم ضعف ہے ۔ یہ نہیں نکلا کہ اس میں ضعف ہے ہی نہیں ۔

بہر حال مسند احمد والی روایت کی کمزوری وہ جانتے تھے اسی لئے اس کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اس کی تائید میں کوئی متابع اور شاہد لائیں ۔ معلوم ہے کہ شاہد مل جانے سے ضعیف روایت کو تقویت پہنچ جاتی ہے ۔ چنانچہ انھوں نے نہایت طمینان سے کہدیا کہ ابنِ جریجؒ کی روایت مسند احمد والی روایت کے لئے شاہد ہے ۔ حالاں کہ ہم سے کہیں زیادہ انھیں اس فنّی قاعدے کا علم رہا ہوگا کہ شاہد کچھ نہ کچھ جاندار ہونا چاہیئے ورنہ وہ قطعاً بے کار ہوگا ۔ ایک ضعیف روایت کو اس سے بڑھ کر ضعیف روایت تقویت نہیں پہنچا سکتی ۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی انھوں نے ابنِ جریج والی اس روایت کو بطور شاہد پیش کر دیا جو عقل اور نقل دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور ابنِ قیمؒ بھی کسی طرح اسے جاندار ثابت نہیں کر سکے ہیں ۔ یہ کم و بیش ایسا ہی ہوا جیسے کسی بیمار کو سہارے سے چلانے کے لئے ایک مفلوج آدمی پیش کر دیا جائے جو خود ہی چلنے سے معذور ہو ۔ یا ایسا ہوا جیسے ایک مشتبہ ملزم کی صفائی میں اس سے بڑھ کر مشتبہ گواہ بلا لیا جائے ۔ ابنِ جریجؒ کی روایت تو دوسری مذکورہ وجوہ کے علاوہ مجرّد اس ایک وجہ سے بھی ساقط الاعتبار ہے کہ اس میں واقعۂ طلاق کو رکانہؓ اور انکی بیوی کے بجائے ان کے ماں باپ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ رکانہؓ کے باپ عبد یزید کو اسلام کا زمانہ نہیں ملا ۔

ابنِ قیمؒ کا مزید سہو

اور دیکھئے ۔ ابنِ قیمؒ اغاثۃ اللھفان میں یوں فرماتے ہیں :۔

"ہمارے بڑے بڑے شیوخ جو عللِ حدیث سے باخبر تھے جیسے امام احمدؒ اور بخاریؒ اور ابوعبیدہؒ وغیرہم انھوں نے حدیثِ بتّہ کو ضعیف ٹھیرایا۔"

اور زاد المعاد میں یہ فرماتے ہیں :۔

"ترمذیؒ نے بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیثِ رُکانہؓ مضطرب ہے کیوں کہ کسی روایت میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ رُکانہؓ نے تین طلاقیں دیں کسی میں کہا جاتا ہے کہ ایک دی کسی میں کہا جاتا ہے کہ طلاقِ بتّہ دی ۔ اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ اسکے تمام طُرق ضعیف ہیں ۔"

اہلِ نظر کے لئے اس تضاد کو سمجھنا مشکل نہیں جو ابنِ قیمؒ کے ان دونوں بیانوں میں پایا جارہا ہے ۔ پہلے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام احمدؒ اور بخاریؒ وغیرہ نے حدیثِ رکانہؓ کہیں نہیں بلکہ صرف بتّہ والی روایت میں کوئی ایسی علّت اور خامی پائی ہے جس کی بنا پر وہ ضعیف ہوگئی ۔ لیکن دوسرا بیان واضح کر رہا ہے کہ ان بزرگوں نے مجرّد بتّہ والی روایت میں کوئی علّتِ تشخیص نہیں کی بلکہ رُکانہؓ کا واقعہ بیان کرنے والی تمام روایات کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بنا پر یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ حدیثِ رُکانہؓ مضطرب ہے اور مضطرب ضعیف ہی ہوتی ہے ۔ پہلے بیان کا حاصل یہ نکلتا تھا کہ صرف بتّہ والی روایت کو ضعیف قرار دیکر ایک طرف ڈالدیا جائے اور مسند احمد والی اور جریجؒ والی روایات کو قبول کرلیا جائے ۔ جن کے نتیجے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے تین اکٹھی طلاقوں کو ایک قرار دیا تھا ۔ اور دوسرے بیان کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جتنی بھی روایتیں رُکانہؓ کا واقعہ بیان کر رہی ہیں ان سب کو طاق پر رکھدیا جائے اور کوئی بھی ان سے استدلال نہ کرے ۔

بات کچھ پیچیدہ نہیں ۔ امام ابنِ قیمؒ ہی کی نقل کے مطابق جب امام احمدؒ یہ کہتے ہیں کہ حدیثِ رُکانہؓ کے تمام طُرق (جن جن سندوں سے یہ روایت آئی ہے وہ سب سندیں) ضعیف ہیں تو کیا اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس طریقے (سند) سے یہ مسند احمد میں روایت ہوئی ہے ۔ وہ بھی ضعیف ہے ۔ اور ابنِ قیمؒ ہی کی تصریح کے مطابق جب

امام بخاریؒ یہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ رُکانہؓ اختلافِ بیانی کی وجہ سے مضطرب ہے تو کس
اس کا مطلب اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ نہ مسند احمد والی روایت کا اعتبار نہ ابوداؤد
والی روایتوں کا۔ مولانا حامد علی جیسا آدمی اگر ازراہِ سادہ لوحی یہ سمجھ لے کہ اضطراب کے نتیجے میں
فقط بتہ والی روایت بے کار ہوتی ہے مسند احمد والی نہیں تو قابلِ معافی ہے۔ لیکن ابن
یا دوسرا کوئی صاحبِ فن استاد بھی ایسا سمجھے تو اس پر حیرت کرنی ہوگی۔ اضطراب اگر امام
احمدؒ یا بخاریؒ وغیرہ نے بتہ والی روایت کی سند یا متن میں بتایا ہوتا تب تو الگ بات
لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ ترمذی موجود ہے اٹھا کر دیکھ لی جائے نہ تو اس روایت میں فی ذاتہٖ کسی
قسم کا اضطراب ہے نہ بخاریؒ اور احمدؒ وغیرہ سے ایسی کوئی بات منسوب ہے۔ ایسا اگر ہوتا
پھر ان بزرگوں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی کہ حدیثِ رُکانہؓ مضطرب ہے۔ حدیثِ رکانہ
کو مضطرب قرار دینا قطعی طور پر معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ امام احمدؒ و بخاریؒ وغیرہ کے نزدیک
رکانہؓ کا واقعہ بیان کرنے والی جملہ روایات میں ایسی کوئی وجہِ ترجیح موجود نہ تھی جس کی بنا پر
ایک کو دوسری پر فوقیت دی جائے۔ اگر موجود ہوتی تو اضطراب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا
راجح روایت قبول کر لی جاتی اور باقی روایات کو مُنکر و شاذ کے خانے میں رکھ دیا جاتا۔
جب وجہِ ترجیح نہ مل سکی اور مضمون میں اختلاف ہے تو انھیں کہنا پڑا کہ حدیثِ رکانہؓ مضطرب ہے۔
اس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ ابن قیمؒ جو مسند احمد والی روایت کو ابوداؤد کی بتہ والی روایت کے
مقابلہ میں زیادہ صحیح اور فائق قرار دے رہے ہیں ان کا یہ فعل خود امام احمدؒ اور بخاریؒ
وغیرہ کی تصریح کے خلاف ہے۔ وہیں یہ بھی ثابت ہوا کہ جو دعویٰ انھوں نے اغاثۃ اللہفان
میں فرمایا تھا سراسر باطل ہے۔ ان کے اور ہمارے شیوخ و اساتذہ امام احمدؒ اور بخاریؒ
وغیرہ حدیثِ بتہ کو ضعیف نہیں ٹھیرا رہے ہیں بلکہ واقعۂ رکانہؓ بیان کرنے والی تمام روایات کو
اضطرابِ مضمون کے باعث ضعیف ٹھیرا رہے ہیں۔ ورق الٹ کر نظر ڈالیے۔ امام بخاریؒ
جب یہ کہا کہ "کسی روایت میں تو تین طلاقوں کا ذکر کیا جاتا ہے" تو صاف طور پر
ان کا اشارہ مسند احمد والی ہی روایت کی طرف تھا کیوں کہ اسی میں ہے کہ "رکانہؓ نے
بیوی کو تین طلاقیں دیں" اور ابنِ جریجؒ والی روایت کی طرف بھی تھا کیونکہ اس میں بھی تین
ہی کا ذکر ہے۔ لہٰذا بلا ریب ثابت ہو گیا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک یہ روایات بھی
قابلِ اعتماد نہیں۔ اگر ان کے نزدیک یہ سند کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوتیں اور بتہ والی

روایت کی سند میں کوئی خامی ہوتی پھر تو فن کے معروف اصول کے مطابق بتہ والی
روایت کو ساقط الاعتبار قرار دے کر وہ یہ کہتے کہ مذکورہ دونوں روایات صحیح ہیں۔
اضطراب کا پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ اضطراب کا وجود ہی اس پر منحصر ہے کہ امام بخاریؒ و
امام احمدؒ کے نزدیک بتہ والی روایت بھی سنداً اتنی ہی مضبوط ہو جتنی دوسری متقابل روایتیں
ہمارے بھولے دوست مولانا حامد علی ابن قیمؒ کی خوشہ چینی کرتے ہوئے
لکھ تو جاتے ہیں :-

"امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے حدیث بتہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے
کہا وہ مضطرب ہے کیوں کہ اسمیں کبھی ثلاثًا آتا ہے اور کبھی واحدۃً۔ حافظ
منذریؒ بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی سند
اور متن دونوں میں اضطراب ہے۔" (ص ۱۲۵)

لیکن ذرا نہیں سمجھتے کہ وہ کتنی مضحکہ خیز بات لکھ گئے۔ حدیثِ بتہ اور حدیثِ رُکانہؓ
کا فرق ہمارے دوست کے دماغ سے محو ہو گیا۔ وہ اب سمجھ لیں کہ حدیثِ بتہ تو اس
خاص روایت کا نام ہے جس میں رُکانہؓ کے گھر والوں نے یہ بیان کیا ہے کہ رُکانہؓ نے
طلاقِ بتہ دی تھی۔ اور حدیثِ رُکانہ کا لفظ جب محدثین بولتے ہیں تو ان کا رُوئے سخن
کسی ایک روایت کی طرف نہیں ہوتا بلکہ ان تمام روایات کی طرف ہوتا ہے جن میں
رُکانہ کا قصہ بیان ہیں ہے۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے سوال حدیثِ
رُکانہؓ کے بارے میں کیا تھا حدیثِ بتہ کے بارے میں نہیں۔ امام بخاریؒ کا جواب
خود اس پر ناطق ہے۔ کیا سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آرہا ہے کہ حدیثِ بتہ میں تو فقط
ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ رُکانہؓ نے طلاق بتہ دی۔ جب بخاریؒ یہ فرماتے ہیں کہ
"اسمیں کبھی ثلاثًا آتا ہے کبھی واحدۃً" تو بداہۃً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ارشاد کا
تعلق حدیثِ بتہ سے نہیں حدیثِ رُکانہؓ سے ہے۔ حدیثِ رُکانہ یعنی واقعۂ رُکانہ
بیان کرنے والی متعدد روایات ہی میں یہ اختلافِ بیان پایا جا رہا ہے اور اسی
اختلاف کا نام فن میں "اضطراب" ہے۔

اسی طرح جب حافظ منذریؒ سند اور متن کے اضطراب کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا
روئے سخن حدیثِ بتہ کی طرف نہیں حدیثِ رُکانہؓ کی طرف ہوتا ہے۔ حدیثِ بتہ کی

۔سند بھی اور متن بھی دونوں چیزیں موجود ہیں خوردبین لگا کر دیکھ لیجئے۔ اسمیں کہیں اضطرا
نام ونشان بھی ہے ؟ ۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امام بخاریؒ کی طرح حافظ من
بھی یہی مقصود ہے کہ واقعۂ رُکانہؓ بیان کرنے والی جتنی روایات آئی ہیں ان کی سند میں
اور متون میں اضطراب اور ٹکراؤ واقع ہو رہا ہے ـــــــ اس واضح ترین صورت
کی موجودگی میں بھی اگر ہمارے مولانا حامد علی یہ نہ سمجھ سکے کہ بخاریؒ سے ان کے شاگرد
سوال حدیثِ بتّہ کے بارے میں نہیں حدیثِ رُکانہؓ کے بارے میں تھا تو بتا
اس سادہ لوحی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے ؟ ۔ حد ہے جب وہ یہ الفاظ حوا
قلم کرتے ہیں :۔

"وہ امام ترمذیؒ) امام بخاریؒ کے علاوہ امام احمدؒ کے حوالے سے
بھی فرماتے ہیں کہ اِنَّ طُرُقَہٗ ضَعِیْفَۃٌ "

(اس کی سب سندیں ضعیف ہیں)

اس وقت بھی ادراک نہیں کرتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ حدیثِ بتّہ تو واقعۂ
رُکانہؓ کا محض ایک طریق ہے۔ جب امام احمدؒ نے یہ کہا کہ اس کے تمام طریق ضعیف
ہیں تو بداہتہً اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیثِ رُکانہؓ یعنی قصّۂ رکانہؓ جن جن طریقوں (سندوں)
نقل ہوا ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ اس میں خود مسند احمد والا طریقہ بھی آ گیا اور ابن ج
والا بھی۔ پھر منقولہ عبارت پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے "بھی" کا لفظ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ
خود حامد علی صاحب کے نزدیک بھی امام ترمذیؒ نے امام بخاریؒ سے جو کچھ نقل فرمایا وہی
امام احمدؒ سے بھی نقل فرمایا۔ تو نتیجہ اس کے سوا کیا نکلا کہ امام احمدؒ کی طرح امام بخاریؒ نے
بھی حدیثِ رُکانہؓ کے تمام ہی طُرُق کو اضطرابِ مضمون کے باعث ضعیف کہا تھا نہ کہ
حدیثِ بتّہ والے طریق کو۔

سخن شناس نئی دلبرے خطا اینجاست

خُلاصۂ بحث

یہاں تک کی بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ امام بخاریؒ ہوں، امام احمدؒ ہوں، حافظ
منذریؒ ہوں کسی بھی استاذِ فن نے حدیثِ رُکانہؓ کو سندوں کے اعتبار ضعیف قرار نہیں دیا

خصوصًا بتّہ والی روایت کی سند میں تو اس معمولی کلام کے علاوہ کوئی کلام ہی نہیں جسکا
شافی جواب ہم شروع میں دے آئے ہیں۔ ان حضرات نے صرف اضطراب کا
حکم اختلافِ مضمون کے اعتبار سے لگایا۔

اب ہم ایک بات تو یہ کہیں گے کہ اضطراب فی الحقیقت ہے ہی نہیں اصولِ
فن کے اعتبار سے اضطراب صرف اس صورت میں مسلّم ہوتا ہے جب تمام روایات
میں معنوی مطابقت پیدا نہ کیجا سکے۔ یہاں فقہائے کرامؒ نے مطابقت پیدا کی ہے
اور جیسا کہ ہم ذکر کر آئے متن (مضمونِ حدیث) کا میدان فقہار کا ہے محدثین کا نہیں
فقہار کہتے ہیں رُکانہؓ نے طلاقِ بتّہ دی تھی، یعنی یا تو یوں کہا تھا کہ تجھ پر طلاقِ بتّہ، یا
طلاق، طلاق طلاق "تین بار کہہ گئے تھے۔ دونوں ہی صورتیں ایسی ہیں جنھیں کوئی بھی
ناقل بایں طور بیان کر سکتا ہے کہ رُکانہؓ نے تین طلاقیں دی تھیں۔ چنانچہ مسند احمد
والی روایت ہو یا ابن جُریجؒ والی۔ اس میں اگر راوی نے یہ کہا ہے کہ رُکانہؓ نے تین
طلاقیں دیں تو اسے جھُٹلانے کے بجائے یہ تاویل کرنا بالکل آسان ہے کہ واقعے
کو اس نے سطحی انداز میں بیان کر دیا۔ سطحی اعتبار سے تو بہرحال رکانہؓ نے تین ہی طلاقیں دی تھیں۔ کیونکہ لفظِ
بتّہ بھی طلاقِ ثلث ہی کے لئے مستعمل تھا لہٰذا راوی نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ البتّہ
رُکانہؓ اور رسُولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گفتگو سے چونکہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ
رُکانہؓ نے صریح تین طلاقیں نہیں دیں بلکہ ان میں ابہام تھا اور ابہام کی صورت میں
نیّت اور ارادے کی تحقیق قرینِ قیاس ہے لہٰذا جب رُکانہؓ نے قسم کھائی کہ میں نے
ایک کی نیّت کی تھی اور حضورؐ نے دوبارہ بھی قسم دلا کر اس کی تصدیق کر لی تو ثابت
ہو گیا کہ صورۃً اور ظاہراً تین نظر آنے والی طلاقیں حقیقت میں تین نہیں تھیں۔ بلکہ
ایک ہی تھی۔ لہٰذا رجوع کی اجازت ایک طلاق پر ملی تین پر نہیں ملی۔

یہ ہے فقہار کی کوششِ تطبیق جس کے بعد کسی روایت کو ردّ کرنے کی
ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس تطبیق کو کوئی پسند نہ کرے تو ہم عرض کریں گے کہ مسند احمد والی روایت تو اس لئے ساقطُ الاعتبار
ہے کہ ایک تو خود امام احمد اس کے خلاف مذہب رکھتے ہیں۔ دُوسرے وہ اسے
خود ہی ضعیف بھی قرار دے رہے ہیں۔ تیسرے اس میں محمد بن اسحاقؒ ہیں جن کی
ثقاہت پر اتفاق نہیں۔ چوتھے اس میں داؤد الحصینؒ عکرمہؓ سے روایت کر رہے ہیں۔

اور اس طریق کو بعض اساتذہ نے مخدوش بتایا ہے۔ پانچویں اس میں گھر سے باہر کے لوگ عین گھریلو واقعے کی روایت اس طرح بیان کر رہے ہیں جو صاحبِ واقعہ کے بیٹے اور اہلِ خانہ کے بیان سے مختلف ہے۔ اس خامی کو امام ابوداؤدؒ جیسے ماہرِ فن نے علت قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کسی عامر جیسے نالائق کی دماغی اُپج ہے۔

اور ابن جریجؒ والی روایت کے ساقط الاعتبار ہونے کی بھی ایک وجہ تو یہی آخری وجہ ہے جس کی امام ابوداؤدؒ نے نشاندہی بھی کردی ہے۔ دوسری وہ وجوہ ہیں جن کا ہم پیچھے ذکر کر آئے۔ لہٰذ وہ دونوں روایتیں ساقط الاعتبار ہوئیں جن کی بنا پر یہ گمان کیا جا رہا تھا کہ حدیثِ رُکانہ مضطرب ہے۔ مضطرب کہاں رہی۔ جب میدان میں اکیلی بتّہ والی روایت باقی رہ گئی۔ اس کی نہ سند میں کوئی اضطراب ہے نہ متن میں۔ اور جیسا کہ ہم شروع میں تفصیل پیش کر آئے اس کی صحت پر مُہرِ تصدیق متعدد اربابِ فن لگا چکے ہیں حتّٰی کہ علامہ شوکانیؒ تک اعتراف کر گئے ہیں کہ قصۂ رُکانہؓ میں پایۂ ثبوت کو پہنچنے والی روایت یہی بتّہ والی روایت ہے۔ لہٰذ ثابت ہوگیا کہ امام بخاریؒ یا حافظ منذریؒ وغیرہ کا دعوئ اضطراب صحیح نہیں کیوں کہ اختلاف پیدا کرنے والی روایات فن کی کسوٹی پر کھوٹی نکل گئیں اور واحد مضمون والی روایت قوی دلائل سے ترجیح پا گئی۔

بصورتِ تسلیم

اب فرض کیجیے، ہم مانے لیتے ہیں کہ حدیثِ رُکانہؓ مُضطرب ہی ہے۔ لیکن ابنِ قیمؒ اور ان کے مقلدین کا یہ تصوّر کر لینا قطعاً بے بنیاد ہے کہ امام بخاریؒ وغیرہ نے صرف بتّہ والی روایت پر اضطراب کا حکم لگایا۔ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں کہ ان کا رُوئے سخن رُکانہؓ کا واقعہ بیان کرنے والی تمام روایات کی طرف تھا۔ تنہا حدیثِ بتّہ کی طرف نہیں۔ اور ہر شخص کھلی آنکھوں سے خود بھی دیکھ سکتا ہے کہ حدیث بتّہ کے متن یا سند میں اضطراب کی پرچھائیں بھی نہیں۔ پھر ثمرہ اس کے سوا کیا حاصل ہوتا کہ امام بخاریؒ کی رائے پر اصرار کرنے والے واقعۂ رُکانہؓ کی جملہ روایات کو ردّی مانیں جن سے نہ وہ دلیل پکڑ سکتے ہیں نہ ہم۔ یہ انتہائی غیر عالمانہ اور غیر سنجیدہ بات

کہ امام بخاریؒ کا رُوئے سخن متعین ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص یہ کٹ حجتی کرے کہ بتّہ والی روایت تو بے کار ہو گئی اور مُسند احمد والی یا ابنِ جریجؒ والی صحیح سلامت ہے۔ یہ لغو بات ناواقفِ فن اور نافہموں کے کہنے کی ہے۔ اہلِ فن کے لئے اس کی لغویت ظاہر و باہر ہے۔

تہ دَرتہ

قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ابنِ قیمؒ جیسے علامہ نے باوجود اخلاصِ نیّت کے ایسی موٹی غلطیاں کیسے کیں۔ اس کا جواب ان لوگوں کے لئے مشکل نہیں جو انسانی نفسیات پر کچھ نظر رکھتے ہیں۔

مشہور مثل ہے کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"۔ ایک ذی فہم آدمی جب دریا سے باہر کھڑا ہو تو وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ طوفان میں گھرے ہوئے کسی آدمی کو بالشت بھر کی ٹہنی ڈوبنے سے نہیں بچا سکتی۔ لیکن یہی ذی فہم اگر طوفان میں پھنس جائے — اور اس وقت گز بھر کے فاصلے پر اسے بالشت بھر کی ٹہنی نظر آئے تو وہ فطرتاً اسکی طرف سہارے کے لئے لپکے گا۔ اس وقت اس کی پہلی والی فہم جبلّت کے تابع ہو جائیگی۔

ابنِ قیمؒ زیرِ بحث مسئلہ میں تقریباً اسی تمثیل کا مصداق ہیں۔ انھوں نے کسی وجہ سے یہ رائے پسند فرمالی ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں تین نہیں ہونی چاہئیں۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ جمہورِ امّت کی رائے اس کے خلاف ہے اور ان کے پاس اپنی رائے کے حق میں بہت سی حدیثیں اور متعدد صحابہؓ کے فتوے موجود ہیں۔ اس کے برعکس ابنِ قیمؒ کے پاس اپنی رائے کے حق میں کسی صحابیؓ کا فتویٰ نہیں۔ صرف دو حدیثیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح ان کا سہارا بن سکتی ہیں۔ ایک طاؤسؒ کی روایت کردہ ابنِ عباسؓ والی اور ایک حدیثِ رُکانہؓ۔ حدیثِ رُکانہؓ میں مشکل پیش یہ آگئی ہے کہ اس کے مختلف طُرق میں ایک طریقہ (وہی بتّہ والا) جمہور کے حق میں جا رہا ہے۔ البتّہ دو طریقے (ایک مسند احمد والا اور ایک ابنِ جریجؒ والا) ان کے حق میں کام آسکتا ہے۔ اب قدرتی بات ہے کہ وہ ایک طرف یہ کوشش کریں گے کہ جمہورِ امّت والی روایات کو یا تو ضعیف ثابت کردیں۔ یا ان کے معانی کو اپنے مفید مطلب بنائیں۔ دوسری طرف یہ کوشش کریں گے

کہ ان کے حق میں جانے والی مذکورہ دونوں حدیثیں زیادہ سے زیادہ قوی مان لی جائیں
ان دوگونہ کوششوں میں ان کا اخلاص اپنی جگہ باقی ہے اور کارفرمائی صرف نفسیات
کی ہورہی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اپنی "صحیح" میں حدیث بتّہ والے
طریقے کو پسند فرمایا۔ اب امام ترمذیؒ اگر اپنے استاذ بخاریؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ
حدیث رُکانہؓ میں اضطراب ہے تو عین ممکن ہے کہ حدیث رُکانہؓ سے بخاریؒ کی مراد
یہی حدیث بتّہ ہو اور اسی کو انھوں نے مضطرب یا ضعیف اس بنا پر کہا ہو کہ انہی
ان کے نزدیک کچھ راوی مجہول الحال ہیں۔ لہٰذا بخاریؒ کے ریمارک کا مطلب یہ
نہیں کہ حدیث رُکانہؓ کے تمام طریق ضعیف ہیں بلکہ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ صرف
بتّہ والا طریق ضعیف ہے۔ لہٰذا اس سے گلو خلاصی ہوئی۔ رہا مسند احمد والا یا ابن جریج
والا طریق تو ان دونوں کی تضعیف بخاریؒ نے نہیں کی لہٰذا وہ اپنی جگہ ثابت و سالم
اور ان سے پسندیدہ ہی موقف کو سہارا مل رہا ہے۔

یہ گویا ڈوبتے نے تنکے کا سہارا لیا اور اس وقت منطق، فن، دراست سب
جبلی نفسیات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ابن قیمؒ یہ تک بھول گئے کہ میں خود زاد المعاد
میں وہ فقرہ لکھ آیا ہوں جس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ امام بخاریؒ نے حدیث بتّہ
کی تضعیف نہیں کی بلکہ واقعۂ رُکانہؓ بیان کرنے والی تمام ہی روایات کی تضعیف
کی تھی جن میں مسند احمد کی اور ابن جریجؒ کی روایات بھی شامل ہیں۔

نیز ایک اور بات بھی ان کی بصیرت سے اوجھل ہوگئی۔ یہ کہ حدیث بتّہ کی سند میں
مجہول راوی ہیں ہی کہاں ؟۔ اگر ابو داؤدؒ نے ایک مقام پر ازراہ اختصار یہ کہدیا ہے کہ
صاحب واقعہ رُکانہؓ کا بیٹا اور ان کے اہلِ خانہ واقعہ کو زیادہ صحیح جان سکتے ہیں تو اسی
جگہ کچھ فصل سے انھوں نے وہ روایت بھی تو نقل کردی ہے جس میں کوئی راوی......
اصطلاحًا مجہول نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ابو داود شریف۔ اس میں مدارِ روایت امام شافعیؒ پر ہے کیا کوئی
یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ امام شافعیؒ کو بخاریؒ نے مجہول وضعیف کہا ہوگا۔
امام شافعیؒ اپنے چچا محمد بن علی بن شافعؒ سے یہ روایت کرتے ہیں۔ ان بزرگ کی
توثیق اگر کتبِ فن میں نہ ملے تب بھی کیا یہ بات کافی نہیں کہ امام شافعیؒ جیسا ناقدِ فن

ان پر اعتماد کر رہا ہے لیکن تہذیب میں تو ابن حجرؒ نے تشریح بھی کردی ہے کہ امام
شافعیؒ اپنے ان چچا کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ یہ چچا عبید اللہ بن علیؒ سے روایت کرتے ہیں
ان کے بارے میں بھی بذل المجہود میں الخلاصہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ امام
شافعیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ان عبید اللہؒ نے روایت لی ہے نافع بن عجیرؒ سے
جنھیں ابن حبانؒ نے ثقات (قابلِ اعتماد) لوگوں میں درج کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے
کہ وہ صحابہؓ میں سے ہیں (جیسا کہ ابن حجرؒ کی تہذیب میں موجود ہے۔)

اب بتایئے مجہول راوی کون سا رہا۔ پھر متابع یعنی اس روایت کی ہمنوائی کرنے والے
ایک زبیر بن سعیدؒ بھی موجود ہیں جو اگرچہ متکلّم فیہ ہیں مگر اس درجہ میں یقینًا ہیں کہ بطورِ متابع
پیش کئے جاسکیں۔

اور، ایک اور بات بھی یاد کرلی جائے۔ ہم پیچھے ابن جریجؒ والی روایت کے
سلسلے میں ابن قیمؒ ہی کا ارشاد ان کی زادُ المعاد سے نقل کر آئے ہیں کہ جب کوئی
امامِ ثقہ کسی مجہول سے روایت کرے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس مجہول کو قابلِ
اعتبار قرار دے رہا ہے اِلّا یہ کہ کوئی جرح اس مجہول کے خلاف موجود ہو۔ تو کیا خود
ابن قیمؒ ہی کے نقطۂ نظر سے یہ بات شافی کافی نہیں کہ فلاں شخص سے امام شافعیؒ جیسا
ثقہ روایت کر رہا ہے۔ اور کوئی جرح اس فلاں کے خلاف اربابِ فن سے منقول نہیں ہے

غرض یہ کہ ابن قیمؒ نے ______ اللہ اُن کے مراتبِ عُلیا کو اور بڑھائے
فکر و استدلال کی ایک خاص سمت میں بہتے ہوئے یہ سب نظر انداز کردیا۔ اور یہ بھی
نظر انداز کردیا کہ اِن کے امامِ مذہب امام احمدؒ تک حدیثِ رُکانہؓ کے تمام ہی طریقوں کو
اپنے مسند احمد والے طریقے سمیت ضعیف بتا رہے ہیں اور یہ بھی نظر انداز کردیا کہ
جس ابن جریجؒ والی روایت کو وہ بہت پسند کر رہے ہیں اس میں صاحبِ واقعہ رُکانہؓ
نہیں رُکانہؓ کا باپ ہے ______ تحقیق تو کرلیتے کہ یہ باپ ہے کون
صاف ظاہر ہے کہ اگر انھیں یہ علم ہوجاتا کہ اس باپ نے تو اسلام کا زمانہ ہی نہیں
پایا تو اس روایت کو وہ سینے سے نہ لگاتے۔ مگر تحقیق کی ضرورت نفسیاتی کیفیت نے
محسوس نہیں ہونے دی۔ کیوں تحقیق کی جائے جب کہ بحالتِ موجودہ یہ روایت کچھ
سہارا دے رہی ہے۔ خدا شاہد ہے ابن قیمؒ کے اخلاص و دیانت میں ہمیں شبہ نہیں

مگر اس میں بھی ہمیں شبہ نہیں کہ وہ غیر معصوم تھے اور غیر معصوم بارہا نفسیات کے زیر اثر ایسے اقوال و افعال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو ظاہراً اخلاص کے خلاف نظر آتے ہیں مگر فی الواقع اس کی نیت میں فساد نہیں ہوتا۔ بھول چوک بھی انسان کی قدرتی کمزوری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اغاثۃ اللہفان لکھتے وقت وہ بعض ان فقروں کو فراموش کر گئے ہیں جو زادُ المعاد میں حوالۂ قلم کر چکے تھے۔ ایسی بھول چوک انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے جو قابلِ معافی ہے۔ اللہ ہم سب کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ آمین۔

ابن قیمؒ کی ایک شدید لغزش

جی تو یہ چاہتا تھا کہ امام ابنِ قیمؒ نے اس مسئلہ میں جتنا کچھ بھی زور باندھا ہے اس کی سطر سطر کا تجزیہ کر دیا جائے تاکہ جو حضرات اس مسئلے میں ان پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں انہیں ادراک ہو جائے کہ جمہورِ اُمت کے مقابلہ میں ابنِ قیمؒ کی ذہانت اور قابلیت سبقت نہیں لے جا سکی بلکہ روشنیِ طبع کہیں کہیں تو ان کے لئے زنجیرِ پا بن گئی ہے۔

مگر کتنے قارئین ہیں جو اس دقیق و بسیط علمی بحث کا تحمل کر سکیں گے اس لئے اب ایک دو نمونوں پر بات ختم کرنی ہوگی۔

ابنِ قیمؒ کی جس غلطی کو ہم شدید تصور کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک حالتِ حیض میں طلاق پڑتی ہی نہیں۔ یہ شیعوں کے ایک فرقہ کا مسلک ہے۔ حالتِ حیض میں طلاق واقع ہونے پر اتنی قوی روایات گواہ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے ابنِ قیمؒ بر جو مجرد ایک قیاسی منطق پر بھروسہ کر کے ساری ہی روایات کی صریح البطلان تاویلیں کرتے چلے گئے ہیں۔

مثلاً ملاحظہ فرمایا جائے۔ بخاری میں متعدد سندوں سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ابنِ عمرؓ نے بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دیدی۔ ان کے والد حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابنِ عمرؓ کو چاہیئے کہ رجوع کر لے۔ (لیراجعھا)

اس حدیث کی صحت سے انکار تو ممکن نہیں تھا مگر ابنِ قیمؒ کی ذہانت ایک اور

نکال کر لائی۔ یہ کہ رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مراد "رجوع" سے اصطلاحی رجوع نہیں بلکہ وہ ارشاد یہ فرما رہے ہیں کہ ابن عمرؓ بیوی سے حسبِ سابق تعلق قائم رکھیں

(انّ الرّجعۃ فی کلامہ لیس بالمعنی المعروف بل المراد ھٰھنا ھو الرد الحسّی الی الحالۃ التی کان علیھا اوّلاً ——— یہ ہے ابنِ قیمؒ کی تاویل)

اب ذرا سوچیئے۔ طلاق و رَجعَت تو اصطلاحی الفاظ ہیں۔ زن و شوہر کے معاملہ میں "طلاق" نام ہے قطع نکاح کا اور "رجعت" نام ہے واقع شدہ طلاق کو لوٹا لینے کا۔ لوٹا لینے کے بعد بھی یہ طلاق شمار ہوتی ہے یہ بھی طے ہے۔ حضورؐ نے جب لیراجعھا فرمایا تو سوائے اس کے کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں کہ ابنِ عمرؓ کی دی ہوئی طلاق واقع ہو چکی اب اسے لوٹا لیا جائے کیوں کہ وہ ایک ہی ہے اور ایک کو لوٹا لینے کی اجازت ہے۔ "رَجعَت" کو اس کے معروف اور اصطلاحی معنے سے ہٹا کر اگر اس طرح کی تاویلات کا جواز تسلیم کر لیا جائے جس کا نمونہ یہاں ابنِ قیمؒ کی نکتہ سنجی نے پیش کیا تب تو لفظِ طلاق کے ساتھ بھی یہ سلوک بہ اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً شوہر نے بیوی سے کہا اَنتِ طَالِقٌ مفتی نے فتویٰ دیا کہ طلاق پڑ گئی۔ شوہر کہتا ہے کہ میں نے دراصل طلاق نہیں دی تھی بلکہ صورت یہ تھی کہ بیوی اپنے میکے پردیس جا رہی تھی۔ مجھے اس کا ملال تھا۔ میں نے فرطِ ملال میں یہ کہا کہ تو مجھ سے جدا ہو رہی ہے!

طلق اور طلاق کے لغوی معنی چھوٹنے اور جدا ہونے کے آتے ہیں ..... طالق کے معنی ہوئے "جدا ہونے والی"۔ میں نے یہ تو کہا نہیں تھا کہ "تو میرے نکاح سے جُدا ہوئی"۔ میرا مقصود وہ حسّی جدائی تھی جو بیوی کے میکے جانے کی وجہ سے واقع ہونے والی تھی۔

فرمایئے! اس میں اور ابنِ قیمؒ کی منطق میں کیا فرق ہے؟ ——— تسلیم کہ رجوع اور رجعت کے لغوی معنیٰ وہ بھی ہوتے ہیں جو انھوں نے لے لئے۔ مگر یہ بھی مسلّم کہ ط۔ ل۔ ق۔ تین حرفوں پر مشتمل لفظ طلق بھی لغۃً مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے متعدد ابواب الگ الگ مطالب کے نکلتے ہیں۔ اگر زن و شوہر کے قضیے میں لفظ طلاق کو اس کے معروف، متعین اور اصطلاحی مفہوم سے

ہٹانا جائز نہیں ہے تو رجوع اور رجعت کو ہٹانا کیسے جائز ہو سکتا ہے ۔ لغت کو اصطلاح پر قاضی بنا کر ابن قیمؒ کی طبّاعی نے جو کارنامہ انجام دیا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اپنی پسندیدہ آرا کی حمایت میں وہ کہاں تک جا پہنچے ہیں ۔

دُوسرا نمونہ :۔ انھوں نے ایک عقلی اصول وضع کیا ہے کہ جن اُمور سے اللہ نے روکا ہے اگر وہ غیر حسّی امور ہیں تو دوسرے سے واقع ہی نہیں ہوتے ۔ اگر واقع کئے جائیں ۔ اس اصول کے تحت ان کا ارشاد ہے کہ حالتِ حیض میں طلاق دینے کو منع کیا گیا اور طلاق امرِ غیر حسّی ہے ۔ لہٰذا وہ واقع ہی نہیں ہوگی اگر کسی نے حالتِ حیض میں دی ۔

اس اصول کو چلئے بلا بحث مان لیا ۔ مگر اس کا تو تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر تین طلاقیں اکٹھی دی جائیں تو ایک بھی واقع نہ ہو لیکن ابن قیمؒ ایک واقع مانتے ہیں ـــــ آخر کیوں؟ یہاں بھی تو فاعل نے فعل ممنوع کا ارتکاب کیا ۔ پھر تین میں سے ایک کیسے پڑ گئی ؟

اگر کہا جائے کہ ایک وقت میں ایک کی اجازت چوں کہ دی گئی ہے اس لئے اسے پڑ ہی جانا چاہئے ۔ تو ہم کہیں گے کہ جو فعل فی نفسہٖ باطل ہو اس کا کوئی بھی جزو واقع اور ثابت نہیں ہوا کرتا جب کہ معاملہ غیر حسّی امور کا ہو ۔ مثلاً نماز کا ہونا نہ ہونا ایک غیر حسّی اعتباری شئے ہے ۔ حسّی اعتبار سے تو نماز بلا وضو بھی ہو جاتی ہے ۔ نماز ظاہراً چند حرکاتِ جسمانی کا نام ہے ۔ لیکن عند اللہ اس کا ہونا نہ ہونا اسی طرح غیر حسّی ہے جیسے نکاح اور طلاق کا وجود و عدم ۔ چنانچہ وضو نہ کیجئے یا غسلِ جنابت نہ کیجئے اور ظاہری طور پر مکمل نماز پڑھ لیجئے تو اعتبارِ شرع میں وہ کالعدم اور باطل ہے ۔

اب ایک شخص وضو کر کے پاک کپڑوں میں فجر کی چار رکعتیں پڑھ ڈالتا ہے ۔ یہ فعل ممنوع ہے ۔ کیا ابن قیمؒ یہ کہیں گے کہ دو رکعت تو ہو گئیں کیوں کہ ان کی مخالفت نہیں تھی البتہ باقی دو باطل ہوئیں اور پڑھنے والا صرف دو رکعت کی حد تک مرتکبِ گناہ ہوا ۔ اب اسے نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ۔

یقین ہے کہ ابن قیمؒ کا یہ جواب نہیں ہو سکتا ۔ حالانکہ جب وہ تین ممنوع طلاقوں کا وہ حصہ واقع مان رہے ہیں جس کی اجازت ہے ۔ تو یہاں بھی نماز کا وہ حصہ واقع مان لینا چاہئے جو ممنوع نہیں بلکہ مطلوب ہے ۔

مزید یہ کہ متعدد صحیح و ثابت روایات سے معلوم ہے کہ کم سے کم عبداللہ بن عمرؓ نے حضورؐ کا مطلب یہی سمجھا تھا کہ طلاق تو واقع ہو گئی اور وہ شمار بھی ہوگی ۔ لیکن اس سے رجوع کر لیا جائے کیوں کہ زمانۂ حیض میں دی گئی ہے ۔ وہ متعدد سائلین کو صراحۃً بتاتے تھے کہ شمار نہ ہونا کیا معنیٰ ؟ جب پڑ چکی تو شمار کیسے نہ ہوگی ۔ لیکن محترم ابن قیمؒ کا جواب حاصلاً یہ ہے کہ ابن عمرؓ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے ۔ وہ غیر معصوم تھے ۔ انھوں نے سمجھنے میں غلطی کی ۔ اس غلطی کی تقلید ہم پر ضروری نہیں ۔ اصول وہی درست ہے جو ہم نے پیش کیا کہ جو غیر حسّی چیز ممنوع ہو وہ واقع ہی نہ ہوگی ۔ ابن عمرؓ کا ذہن اس اصول تک نہیں پہونچا اور انھوں نے طلاق کو واقع مان لیا تو یہ ہمارے لئے حجت نہیں ۔

انصاف کیا جائے ۔ کیا اجتہاد کی یہ شان اور بے تقلیدی کا یہ طنطنہ قابلِ فخر ہے ـ ؟ ہم نہیں کہتے کہ ابن عمرؓ کی ذاتی رائے حجت ہو سکتی ہے لیکن یہاں صرف ذاتی رائے کا سوال نہیں ـــــ سوال اس بات کا ہے کہ کلامِ نبوّت کو ابن عمرؓ سے زیادہ ابن قیمؒ سمجھ رہے ہیں ۔ حالانکہ گزری سب کچھ ابن عمرؓ پر ہے ۔ نورٌ علیٰ نور یہ کہ ابن قیمؒ اس بلند بانگ دعوے کی عمارت محض ایک ایسے ضابطے پر اٹھا رہے ہیں جسے انھوں نے خود وضع کیا ہے ۔ کوئی نقل اس کی صحت پر پیش نہیں کی ۔

یہ ایک دو نمونے ہم نے ان لوگوں کے لئے پیش کئے جو ابن قیمؒ کی ذہانت سے بے طرح مرعوب ہیں ۔ مقصد ذہانت کا انکار نہیں البتہ یہ مقصد ضرور ہے کہ انھیں اتنا بڑا مجتہد نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ابو حنیفہؒ و شافعیؒ اور مالکؒ و احمدؒ کی ہوا بھی اُکھڑ جائے ۔ فنّی لغزشیں بھی اس بحث میں ان سے کم نہیں ہوئیں ۔ حد ہے کہ مسلم کی قوی ترین روایت کے مقابلے میں وہ ایک کم قوی روایت لا کر کہتے ہیں وَھُوَ اِسْنَادٌ صَحِیْحٌ کَالشَّمْسِ (اس کی سند کا صحیح ہونا سورج کی طرح عیاں ہے) حالانکہ ایک راوی اس میں ایسا موجود ہے جس کے بارے میں اربابِ فن نے نشاندہی کی ہے کہ قَدْ کَانَ تَغَیَّرَ فِیْ اٰخِرِہٖ ۔ یعنی اگرچہ وہ ثقہ ہیں لیکن آخرِ عمر میں ان میں کچھ تغیّر واقع ہو گیا تھا ۔ اب نہیں معلوم کہ یہ روایت کب کی ہے ۔ یہ امکان بہرحال ہے کہ آخرِ عمر کی ہو ۔ لہٰذا مسلم شریف کی سندِ قوی سے اس کا کیا مقابلہ ۔ پھر مسلم کی حدیث کا متابع بھی موجود ہے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم کی

حدیث صریح المعنی ہے اور یہ حدیث غیر صریح۔ اس کے جس لفظ سے ابن تیمیہ استدلال کرتے ہیں وہ دو مفہوموں کا متحمل ہے۔ ایک مفہوم مسلم والی حدیث کے مطابق اور ایک خلاف۔ انھیں ضد ہے کہ ہم خلاف ہی مطلب نکال کر مسلم والی حدیث کو مشکوک و مبہم بنائیں گے۔ حالانکہ اس تحکم اور زبردستی کی کوئی بنیاد نہیں۔

ایک اور عقلی استدلال کا جواب

لِعَان میں چار قسموں کی شرط ہے۔ اگر یوں کہے کہ میں چار قسمیں کھاتا ہوں تو شرط پوری نہیں ہوگی بلکہ الگ الگ چار کھانی ہوں گی۔

رمیِ جمار میں سات کنکریاں مارنے کا حکم ہے۔ ایک ہی بار میں ساتؔ ماردیں تو تعمیلِ حکم نہ ہوگی۔ الگ الگ ساتؔ بار مارنی ضروری ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہزار بار سُبحان اللہ! تو یہ ہزار بار شمار نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی بار شمار ہوگا بس اسی طرح تین طلاق کہنے سے تین واقع نہ ہوں گی۔ ان کا مَرَّةً بَعْدَ مَرَّة یعنی ایک کے بعد ایک ہونا شرط ہے۔

اس معارضے کا بہت تفصیلی اور تسلّی بخش جواب ہم دے آئے۔ گزارش کر آئے کہ بزرگو! قیاس مع الفارق کی ایسی بھونڈی نظیر مت پیش کرو۔ لیکن اسی معارضے کی مضبوطی کے لئے ایک منطقی فارمولا پیش کیا گیا ہے اس کا جواب رہ گیا۔ یہ فارمولا مولانا شمس پیرزادہ نے تو ان الفاظ میں حوالۂ قلم کیا ہے کہ ——— "فعل میں زمانۂ واحد میں "مَرَّتَان" کا اجتماع ممکن نہیں"۔ مگر یہ کچھ اچھی ترجمانی نہیں۔ ابن قیمؒ کا فارمولا زیادہ خوبصورت لفظوں میں یہ ہے کہ وقتِ واحد میں ایک ہی فعل واقع ہو سکتا ہے متعدد نہیں ہو سکتے۔ تم کہتے ہو تین طلاق۔ یہ ایک فعل ہے لہٰذا ایک ہی طلاق پڑنی چاہئے۔ متعدد کیوں پڑیں جب کہ فعل واحد ہے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ آپ کا فارمولا سر آنکھوں پر لیکن آپ نے دوؔ مختلف چیزوں کا فرق نہیں سمجھا۔ ایک ہے اَلتَّطْلِيقَاتُ الثَّلٰث (تین طلاقیں ڈالنا) اور ایک ہے اَلطَّلَقَاتُ الثَّلٰث (تین طلاقیں) پہلی چیز افعال کے قبیل سے ہے

اور دوسری مَفَاعِيل کے۔ پہلی عمل ہے اور دوسری ثمرۂ عمل۔ اثرِ عمل۔ حاصلِ عمل طلاق دینے کا فعل شوہر سے متعلق ہے مگر نفسِ طلاق جو اس فعل کا اثر ہے۔ بیوی سے متعلق اور اسی کے ساتھ قائم ہے۔ آپ کہتے ہیں اَنْتِ طَالِقٌ تو طلاق والی ہو صاحبِ طلاق ہے۔ یہ کیسے کہتے۔ اگر طلاق بیوی کے ساتھ قائم نہ ہوتی.... شوہر کو طالق نہیں مطلِّق کہا جاتا ہے کیوں کہ فعلِ طلاق اس کے ساتھ قائم ہے۔

اس قطعی اور بدیہی فرق کو نظر میں رکھتے ہوئے سُنیئے کہ ہم ایک وقت میں فعل کے متعدد ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہے ہیں بلکہ مَفَاعِيل کے متعدد ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ "تجھ پر تین طلاق"، کا زبان سے تلفظ کرنا بلا شبہ ایک ہی فعل ہے ہم نے کب کہا کہ اسے متعدد افعال مانیئے۔ لیکن اس فعل کے مَفَاعِيل یا بہ الفاظِ دیگر مصادیق تین ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے زید دو مختلف عورتوں کا سرپرست ہو اور دو مختلف آدمیوں سے یوں کہے کہ اَنْكَحْتُكُمَا هَاتَيْنِ الْمَرْأَتَيْنِ (میں تم دونوں کو ان دونوں عورتوں کے نکاح کی اجازت دیتا ہوں) مُسلّم ہے کہ اس فقرے سے دونوں کے نکاح کی اجازت صادر ہوگئی۔ اب دیکھ لیجئے۔ زبان سے فقرہ ادا کرنے کا فعل ایک ہی ہے لیکن اجازت دو مختلف مردوں کو حاصل ہوئی اور دو مختلف عورتوں کے لئے حاصل ہوئی اسی کا نام ہے مفاعیل کا متعدد ہونا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ایک ہی فائر سے کئی کئی مرغابیاں شکار ہو جاتی ہیں۔ فعل واحد مگر مفاعیل کئی۔

یہی حال ہے تین طلاقوں کا۔ صاف ظاہر ہے کہ فعلِ طلاق میں نفسِ فعل مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر و حاصِل مقصود ہوتا ہے۔ لفظِ طلاق مِصری کی ڈلی نہیں ہے کہ شوہر اس کا مزہ لینے کے لئے جگالی کرے۔ مقصود ہوتا ہے اسکا وہ اثر اور حاصِل جو اس کے ساتھ شریعت نے وابستہ کر دیا ہے۔ مکتبی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ مقصود مفاعیل ہے فعل نہیں۔ مطلوب طلاق ہے تطلیق نہیں۔ پھر کیا معارضہ رہا۔ اگر ہم مفاعیل کا تعدّد ثابت کرتے ہیں نہ کہ فعل کا۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ آپ کا منطقی معارضہ بس "تین طلاق" کے فقرے تک تو جواب طلب ہو سکتا ہے مگر جب ایک شخص تین فقروں میں تین طلاقیں دے تو یہ معارضہ پیش ہی نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تین الگ الگ ساعتوں میں تین فعل واقع

ہوئے ہیں نہ کہ ایک ساعت میں۔

ابنِ قیمؒ بڑے ذہین تھے مگر ذہانت تو ایک تلوار ہے جو جہاد فی سبیل اللہ میں بھی کام آسکتی ہے اور قتلِ ناحق میں بھی۔ ایک غلط مسلک اختیار کر کے انھوں نے اپنی ذہانت اس کے حق میں استعمال کر ڈالی اور بڑے بڑے نکتے پیدا کئے۔ مگر الحمدللہ! حق وصداقت کسی بھی حربے کے دفاع سے عاجز نہیں ہیں۔

افعالُ واعیانُ

سُنیئے یہاں ایک اور نکتہ۔ ہم خاص طور پر مولانا اکبرآبادی کو سُنانا چاہتے ہیں. جو یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ابنِ قیمؒ نے بڑی مدلّل ومکمل گفتگو کی ہے اور جمہورِ اُمّت کی ہر دلیل انھوں نے کاٹ کر رکھدی ہے۔

نکتہ یہ ارشاد کیا گیا کہ دیکھئے قرآن میں آیا ہے یُؤْتُوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ (انھیں دوہرا ثواب دیا جائے گا) یہاں مَرَّتَین کا مطلب ہے دُگنا۔ دُگنا اَجر افعال کے قبیل سے نہیں اعیان کے قبیل سے ہے لہٰذا ایک ہی زمانے میں دُگنے اجر کا تحقّق ممکن ہے۔ مگر مَرَّتَان کا جو لفظ قرآن میں آیا ہے وہ افعال کے قبیل سے ہے اور اس کا ایک وقت میں جمع ہونا اسی طرح محال ہے جس طرح ایک ہی وقت میں دو حرفوں کا تلفظ محالات میں سے ہے لہٰذا یہ بھی محال ہے کہ ایک دفعہ میں ایک سے زائد طلاق واقع ہو جائے۔

اب اس نکتے کو دَارُالاِنتِقَادْ میں لائیے۔

ابنِ قیمؒ نے قبول لیا کہ ایک سے زاید اعیان کا ایک ہی وقت میں تحقق وقوع ممکن ہے جیسا کہ خود قرآن سے ثابت ہو رہا ہے ـــــ اب ان کی فکری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے لفظ مَرَّتَانِ کو محورِ کلام بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ افعال کے قبیل سے ہے حالاں کہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ آیت میں محورِ کلام اور موضوعِ کلام طلاق ہے نہ کہ مَرَّتَان۔ مَرَّتَان تو بیان ہے طلاق کا۔ بالفاظِ دیگر مبتدا طلاق ہے نہ کہ مَرَّتَان۔ ہر اس جُملہ اسمیہّ میں جو مبتدا اور خبر سے مرکب ہو موضوعِ کلام ہمیشہ مبتدا ہوا کرتا ہے۔

"زید عالم ہے"

یہاں زید مبتدا ہے اور وہی موضوعِ کلام بھی۔ صفتِ علم کا اثبات اسی کیلئے کیا جا رہا ہے۔ علم بجائے خود موضوع نہیں۔ بہ الفاظِ دیگر موصوف ہی محورِ گفتگو ہوا کرتا ہے اور صفات کی حیثیت بیان کی ہوتی ہے۔

غرض آیتِ قرآنی میں لفظ طلاق کو مرکزِ توجّہ بنانے کے بجائے ابنِ قیمؒ غلط طور پر مرّتان کی تنقیح میں پڑ گئے ہیں مَرَّتَان بے شک افعال کے قبیل سے ہے ہم اس سے کب انکاری ہیں۔ لیکن طلاق تو افعال کے قبیل سے نہیں اعیان کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم واضح کر آئے۔ طلاق ایک ایسا عین (مفہومِ معنوی) ہے جو عورت کی صفت ہے۔ اس پر فعل کا اطلاق نہیں ہوتا۔ فعل ہے ایقاعِ طلاق یعنی طلاق واقع کرنا اور ظاہر ہے یہ مرد کا فعل ہے۔ ہم نے کب دعویٰ کیا کہ وقتِ واحد میں متعدد افعال واقع ہو سکتے ہیں ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ وقتِ واحد میں متعدد اعیان اور مفاعیل واقع ہو سکتے ہیں۔ اس دعوے کو ابنِ قیمؒ بھی قبول کر چکے اور قرآن سے ثابت بھی ہو چکا۔ لہٰذا ابنِ قیمؒ کے پاس خلاصی کی راہ اگر کوئی رہ جاتی ہے تو یہ رہ جاتی ہے کہ وہ طلاق کو عین نہ مانیں بلکہ فعل ثابت کریں یہ ناممکن ہے۔ طلاق اور نکاح کا اعیان کے قبیل سے ہونا اتنا ہی قطعی ہے جتنا سر اور کمر کا جسم کے قبیل سے ہونا۔ طلاق ونکاح کو نہ ہاتھ سے چھو سکتے ہیں نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ نہ ناک سے سونگھ سکتے ہیں۔ وہ تو فقط معنیٰ ہیں۔ محض اعتبارات ہیں جن کا دوسرا نام اعیان ہے۔

پھر آیت یُؤْتُوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ کے ذیل میں ابنِ قیمؒ نے بھی مان لیا کہ یہ لفظِ اعیان کے سلسلے میں بھی بولا جا سکتا ہے۔ مانتے کیسے نہیں جب کہ قرآن بول ہی رہا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض بھی وارد نہ ہوئے گا کہ طلاق اگر اعیان کے قبیل سے ہے تو اللہ نے لفظ مَرَّتَانِ کیوں بولا، جو کہ افعال کے قبیل سے ہے۔ بھائی اسی طرح بولا جس طرح یُؤْتُوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ میں بولا۔

یہ تو ہوا منطقی نکتہ کا آپریشن۔ اب ایک اور بات بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارے سادہ لوح مقالہ نگار اس غلط فہمی میں بتلا ہیں کہ جب کوئی شخص "تجھ پر طلاق ہے" کا فقرہ تین بار دہراتا ہے تو وہ گویا ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے رہا ہے۔

ہم اس غلط فہمی کا ازالہ کر آئے۔ بتا آئے کہ بزرگو! ایک وقت کہاں ہے۔ تین اوقات ہیں۔ پہلا وقت تو پہلے فقرے کا تلفظ کرتے ہی گزر گیا۔ پھر اگلے دو فقرے الگ الگ وقتوں میں تلفظ ہوئے ہیں۔

اب یہاں دیکھ لیجئے کہ خود ابن قیمؒ کی نکتہ سنجی نے ثابت کر دیا کہ یہ ایک وقت کے تین فعل نہیں۔ بلکہ تین وقتوں کے تین فعل ہیں۔ اس طرح ثابت کر دیا کہ وہ ایک وقت میں متعدد افعال کا اجتماع بجا طور پر محال کہہ رہے ہیں۔ تمثیل میں انھوں نے حرفوں کی مثال پیش کی کہ کوئی بھی شخص ایک وقت میں دو حرف تلفظ نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ لفظ زید بولتے ہیں تو ابن قیمؒ کے نزدیک حرف زا کا تلفظ ایک وقت میں ہوا۔ حرفِ یا کا تلفظ دوسرے وقت میں اور حرفِ دال کا تلفظ تیسرے وقت میں۔

اب ابن قیمؒ کے خالی مدّاح اور مقلدین ارشاد فرمائیں کہ "تجھ پر طلاق" جیسا نو حرفی فقرہ اگر کوئی شخص تین بار دہراتا ہے تو اسے "ایک ہی وقت" کا فعل قرار دینا منطق ناشاسی اور عقل دشمنی کا کتنا شاندار کارنامہ کہلائے گا۔ ابن قیمؒ کی منطق نے تو صراحتًہ یہ بتا دیا کہ جب کوئی "تجھ" کا لفظ بولتا ہے تو اس کی تا ایک وقت میں بولی گئی، جیم دوسرے اور ھا تیسرے وقت میں۔ اس کے بعد "پر" کی پ چوتھے اور را پانچویں وقت میں۔

کاش ہمارے مقالہ نگار بزرگ کچھ علم الحدیث اور کچھ منطق بھی سیکھتے اگر انھیں حدیثِ رسولؐ اور آثار صحابہؓ اور مذہبِ جمہور سے جنگ کرنی ہی تھی۔ یہ کیا کہ۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مولانا محفوظ الرحمٰن متوجہ ہوں

ہم عرض کر آئے ہیں کہ ابوداؤدؒ کے حوالے سے آپ نے ابن عباسؓ کی طرف ایک قول کی نسبت کی حالانکہ امام ابوداؤدؒ نے اسی جگہ نشاندہی کر دی ہے کہ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا نہیں ہے۔ اس خیانتِ نقل کا جواب تو آپ کے ذمّے ہے ہی۔

مزید خیانتوں کا جواب بھی عطا ہو۔

(۱) آنجناب نے یہ ثابت فرمانے کے لئے کہ تین طلاقوں کا زیر بحث مسئلہ اجماعی نہیں ہے بلکہ اس میں شروع سے اختلاف چلا آ رہا ہے شرح معانی الآثار سے امام طحاویؒ کی عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا جس کا ترجمہ یہ ہے ـــــ "ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے تو ایک ہی پڑے گی۔"

واقعی اس ٹکڑے سے تو آپ کا مقالہ سننے اور پڑھنے والا ہر شخص یقین کر لے گا کہ امام طحاویؒ کسی ایسی قوم (گروہ) کا ذکر کر رہے ہیں جو ہم اہلِ سُنّت ہی میں سے ہے اور اس کا اختلاف کرنا ثابت کرتا ہے کہ تین طلاقوں کے وقوع پر اجماع کا دعویٰ غلط ہے۔

لیکن کیا آپ نے امام طحاویؒ کا قول ادھورا نقل نہیں کیا اور کیا آپ کے نقل کردہ فقرہ کے متصل بعد ہی طحاویؒ کے یہ الفاظ موجود نہیں ہیں کہ اذا کان فی وقت السُّنّۃِ وذٰلک ان تکون طاھرًا فی غیر جماع۔ آپ نے پورے فقرے سے یہ الفاظ حذف کر دیئے۔ حالانکہ یہی وہ الفاظ ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آپ جان بوجھ کر فریب دے رہے ہیں۔

اہلِ علم تو سمجھ گئے ہوں گے۔ عام قارئین سمجھیں۔ امام طحاویؒ اس قوم (گروہ) کا ذکر کر رہے ہیں جس کی رائے یہ ہے کہ نہ تو حالتِ حیض میں طلاق پڑتی ہے نہ اس طُہر میں جس میں صحبت کر لی گئی ہو۔ ہاں اگر ایسے طُہر میں جس میں صحبت نہ کی گئی ہو تین طلاقیں دی گئیں تو ایک واقع ہوگی۔ یہ مسلک شیعوں کے ایک فرقے کا ہے۔ اہلِ سُنّت کا کوئی گروہ اس کا قائل نہیں ہے کیا اسے فریب نہیں کہیں گے کہ طحاویؒ شیعی مسلک کا ذکر کر رہے ہوں اور کوئی شخص نقل میں کاٹ چھانٹ کر کے یہ باور کرائے کہ اہلِ سُنّت کے کسی گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ شیعوں یا رافضیوں یا خارجیوں کے کسی گروہ کا اختلافِ رائے اہلِ سُنّت کی اجماعی رائے کو مشکوک نہیں بنا سکتا ورنہ ابوبکرؓ و عمرؓ کا خلیفۂ راشد ہونا اور حضرت علیؓ کا مسلمان ہونا بھی مشکوک ہو جائے گا۔

(۲) آپ نے اسی جگہ اجماع پر خاک اڑاتے ہوئے مزید تحریر فرمایا:

"علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں بتلایا ہے کہ ابتدا سے یہ مسئلہ اجتہادی رہا اور کوئی واقعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ حضورؐ تک پہنچا اور آپؐ نے اس کی اک شکل متعین فرمادی۔"

یہ لکھ کر آپ نے رُوح المعانی سے ایک فقرہ نقل فرمادیا جو آپ کے اس مفہوم کی ترجمانی کرتا نظر آرہا ہے۔ لیکن ہم بڑے افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ یہاں بھی آپ صریح خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں۔

روح المعانی جزو ۲ ص۱۳۸ کھولئے۔ دوسری ہی سطر سے اس طلاق کی گفت شروع ہوئی ہے جو منکوحہ کو صحبت سے قبل ہی دے دی گئی۔ اس کے بارے ابوحنیفہؒ کا مذہب بیان کیا گیا۔ پھر اسی طاؤسؒ والی روایت کا ذکر کیا گیا جس صراحۃً یہ الفاظ موجود ہیں۔ اذا طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بها واحدة علی عهد رسول اللهؐ الخ (جب کسی نے بیوی کو صحبت کی نوبت آنے سے قبل ہی تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عہدِ صدیقیؓ اور عہدِ فاروقی کے ابتدائی ایام میں وہ ایک مانی جاتی تھیں) پھر خود ابن عباسؓ قبل ان ید (اس سے پہلے کہ صحبت کی ہو) کی صراحت کے ساتھ اسی بات کی تصدیق کر اس کے بعد آلوسیؒ کہتے ہیں:

"اسی طلاقِ غیر مدخولہ کے بارے میں ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے انھیں نافذ کردیا۔"

اور ٹھیک اس کے بعد وہ عبارت ہے جو آپ نے نقل کی ہے و مسئلة اجتهادیه الخ (اور یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔)

اب آپ فرمایئے۔ کیا دو اور دو چار کی طرح یہ بات صاف نہیں هٰذه کا اشارہ کس طرف ہے۔ کیا کسی کو بھی اس میں شک ہوسکتا جس مسئلہ کو آلوسی اجتہادی کہہ رہے ہیں وہ تین طلاقوں کے وقوع کا مس ہے۔ جس میں آپ بحث فرمارہے ہیں اور مقالہ لکھ رہے ہیں۔ بلکہ وہ مخصوص ہے۔ جب کوئی مرد اپنی منکوحہ کو صحبت سے قبل ہی طلاق دے دے۔ اس

آلوسیؒ نے یہ کہا بھی ہے کہ "کوئی واقعہ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ حضورؐ تک پہنچا ہو۔" ظاہر ہے یہ اسی قبلِ دخول والے مسئلے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے ورنہ کون نہیں جانتا اور خود آپ بھی جانتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیسؓ کی تین طلاقوں کا معاملہ اور رکانہؓ کی طلاق کا معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پہنچا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد واقعات کتب حدیث میں موجود ہیں۔

بحث تو آپ فرمارہے ہیں ان تین طلاقوں میں جو صحبت کے بعد بیوی کو دی جائیں لیکن رُوح المعانی سے عبارت لارہے ہیں وہ جو اس سے متعلق ہے ہی نہیں اور دھوکا دے رہے ہیں سادہ لوح عوام کو جن تین طلاقوں کے واقع ہونے نہ ہونے کی بحث چل رہی ہے اس میں اجماع کا دعویٰ درست نہیں بلکہ صاحب رُوح المعانی اسے فقط ایک اجتہادی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایسی تین طلاقوں کا مسئلہ کبھی آیا نہیں!۔

حد ہے۔ منقولہ عبارت کے آگے بھی ابنِ بُکیرؒ والی وہ روایت روح المعانی میں نظر آرہی ہے جس میں یہی قبل ان یدخل بها کی قید موجود ہے۔ یعنی وہ تین طلاقیں جو صحبت سے قبل دے دی جائیں۔ اور آپ بڑے اطمینان سے هٰذه مَسْئَلَةٌ کا مشارٌ الیہ ان تین طلاقوں کے مسئلہ کو دیتے چلے جارہے ہیں جن پر آج گفتگو ہے۔ اسے علمی بددیانتی نہ کہیں تو آپ ہی بتایئے کیا کہیں۔؟

(۳) امام طحاویؒ کی روایت کے مطابق ایک شخص نے حضرت ابنِ عباسؓ سے کہا تھا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ آپ نے اس روایت کا ذکر کرکے ابنِ عباسؓ کا فقط اتنا جواب نقل کیا:

"تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا ارتکاب کیا اور شیطان کی پیروی کی۔"

لیکن یہ ٹکڑا چھوڑدیا فَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا۔ (یعنی اب تیرے لئے اللہ نے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ تین طلاقیں پڑگئیں۔ بیوی حرام ہوگئی) اس ٹکڑے کو چھوڑدینا ایمانداری کی کس قسم سے تعلق رکھتا ہے حالاں کہ یہ فقرہ روایت کی جان تھا یہی ڈنکے کی چوٹ یہ بتارہا تھا کہ اکھٹی تین طلاقوں کا واقع ہوجانا ابنِ عباسؓ کے نزدیک

حضرت عمرؓ کے کسی اعلان سے ہرگز تعلق نہیں رکھتا بلکہ ابنِ عباسؓ اسے اللہ جل
کا فیصلہ تصوّر فرماتے ہیں۔ کیوں کر ممکن تھا کہ ابنِ عباسؓ کے علم میں یہ بات بھی ہو کہ
رسالتؐ اور دورِ صدّیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہوتی تھیں اور وہ اس سائل سے
یوں بھی کہدیں کہ اللہ نے تیرے بچا کے لئے اب کوئی رجوع کا دروازہ کھُلا نہیں رکھا۔

(۴) آپ نے ابنِ حجرؒ کی عبارت روح المعانی کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے اس کا ترجمہ فرمایا:۔

"فاسق سے فاسق آدمی کا ارادہ تاکید معتبر مانا جائے گا اور یہی ہمارا مذہب بھی ہے"

ابن حجرؒ کے فقرے کا مطلب آپ نے صحیح نہیں سمجھا اسے واضح کرنے کے لئے
ہمیں طول اختیار کرنا پڑے گا اس لئے نظر انداز کرتے ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ
"بشرطہٖ" کا ترجمہ و مفہوم آپ نے غائب کر دیا حالانکہ کسی مشروط قول کو شرط حذف
کرکے پیش کرنا دیانت کے خلاف ہے۔ آپ شاید سمجھے ہی نہیں اس کا مطلب۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں شرط اگرچہ واحد آیا ہے لیکن جمع کے مفہوم میں ہے یعنی
شرائط۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے عربی میں عام طریقہ ہے کہ کسی کی عبارت نقل کرتے ہوئے
لکھتے ہیں وَلفظہٖ (اور اس کا لفظ یہ ہے) ظاہر ہے عبارت تو الفاظ کا مجموعہ
ہوتی ہے نہ کہ ایک لفظ کا۔

اب سنیئے۔ جب کوئی تین بار لفظ طلاق دہراتا چلا جائے تو بہر حال
اس کے اس عذر کو قبول نہیں کیا جائے گا کہ میری نیّت ایک کی تھی۔ اس کے لئے
متعدد شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معروف طور پر کذّاب نہ ہو۔ فسق کی بہت قسمیں اور
نوعیتیں ہیں۔ جواری، شرابی، بے نمازی سب فاسق ہیں۔ ان کا فسق بے شک
قبولِ عذر میں مانع نہیں لیکن مسلّمہ اور معروف طور پر کسی کا جھوٹا ہونا ایسا فسق ہے
جس کی موجودگی میں نیّت کی بات نہیں مانی جائے گی۔

دوسرے یہ کہ کوئی ایسی وجہ موجود نہ ہونی چاہیئے جس کی روشنی میں صاف
نظر آرہا ہو کہ اس عورت کا تین طلاق پا جانا اس شخص کے لئے واضح خسارے کا
موجب بن جائے گا۔ مثلاً عورت کافی دولت مند ہو تو اس کا ہاتھ سے نکل جانا
مالی خسارے کا باعث بنے گا لہٰذا ایسی حالت میں فیصلہ ظاہر پر ہوگا اور نیّت کی

تصدیق نہیں کی جائے گی۔

تیسرے یہ کہ حلف لیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ اس نے کہا اور قاضی نے مان لیا۔
حافظ ابنِ حجرؒ نے بشرطہٖ کہہ کر ایسی ہی قیود کی طرف اشارہ کیا ہے مگر آپ
ترجمے میں اسے حذف ہی کر گئے ہیں۔

(۵) آپ نے کہا:۔

"اہلِ سُنّت والجماعت کا ایک طبقہ شروع سے ہی اس کے خلاف رہا ہے لہٰذا
اُمّت کا اجماع نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں ہمارے بعض علماء ائمہؒ اربعہ کا اجماع
بتاتے ہیں مگر یہ بھی مخدوش ہے۔"

معاف کیجئے گا۔ معلوم ہوتا ہے دار العلوم کا نصاب پورا کرنے کے بعد آپ کو
مزید مطالعے کا موقع نہیں ملا اور یہ مقالہ لکھتے ہوئے آپ نے کچھ کتابوں کے ورق
محض اپنے میلان ورجحان کی تائید تلاش کرنے کے لئے اُلٹے پلٹے ہیں۔

آپ کی یہ عبارت غلط در غلط ہے۔ طبقہ تو بڑی بات ہے آپ اسلام کے
ابتدائی چھ سو برسوں میں دو چار بھی ایسے علماء نہیں دکھلا سکتے جن کی مجتہدانہ حیثیت
جمہور نے تسلیم کی ہو اور وہ طلاقِ مجموع کے اجماعی مسلک کے خلاف زبان
کھولتے ہوں آپ سطحی اور ناقص مطالعے کی بنا پر دھوکا کھا گئے ہیں۔ ہمارا پورا
انتقاد پڑھیئے اور پھر آنکھ سے آنکھ ملا کر ان اہلِ سُنّت علماء کے نام گنوایئے جن کا
خلاف اس مسئلہ میں ثابت ہو۔

نیز یہ کہنا بھی قصورِ علم ہے کہ اس مسئلہ میں چاروں ائمہؒ کے اتفاق کی خبر
صرف "ہمارے بعض علماء" دیتے ہیں۔ لَاحَولَ وَلَا قُوّۃ۔ ہمارے محترم ——— یہ تو کم وبیش
مسلّمات میں سے ہے اور سب سے بڑھ چڑھ کر اختلافی دلائل جمع کرنے والے حافظ
ابنِ قیّمؒ بھی اس خبر کو قطعی اور یقینی مانتے ہیں۔ مخدوش چہ معنیٰ دارد! امام مالکؒ
اور اصحابِ احمدؒ کے ایک قول کی من گھڑت کہانی کا تجزیہ ہم کر آئے۔ اگر آپ ہمارے
تجزیے کو درست نہیں مانتے تو بسم اللہ۔ مالکؒ واحمدؒ دونوں اماموں کی اُمّہاتِ کتب
موجود ہیں ان میں دکھلایئے کہاں ہے ایسا کوئی قول۔

(۶) آپ نے تین فتوے بھی نقل کئے ہیں۔ مگر لا حاصل۔ مفتی کفایت اللہ

صاحب نے صرف اس پر زور دیا ہے کہ کسی اہلِ حدیث کو اس مسلک کی بنا پر کافر کہنا یا اس کا
مقاطعہ کرنا درست نہیں۔ صحیح زور دیا۔ ہم بھی اسی کو معقولیت تصوّر کرتے ہیں۔ یہ مفتی صاحب
بھی کہہ رہے ہیں کہ ایک حنفی کا اہلِ حدیث سے فتویٰ لے کر مطلّقہ ثلٰث سے رجوع کر لینا
جائز نہیں تھا۔ ہاں یہ جو انھوں نے فرمایا کہ ——— لیکن اگر وہ بھی مجبوری اور اضطرار کی
حالت میں اس کا مرتکب ہو تو قابلِ درگذر ہے۔"

تو دراصل وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میاں جب وہ گاؤں والا اہلِ حدیث سے فتویٰ
لے کر بیوی سے رجوع بھی کر چکا تو ختم کرو قصّہ۔ کیوں پیچھے پڑتے ہو۔ آخرت میں جو
کچھ باز پُرس ہوگی اُس سے ہوگی۔ تمھیں یا مفتی کو بات بڑھانے کی کیا ضرورت۔

اگر ان کا یہ مطلب نہیں تو پھر آپ ہمیں سمجھا دیجئے کہ شرعی اضطرار کی کون سی قسم
یہاں پائی جا رہی ہے۔ "اضطرار" تو عام اعتبار سے ایک نئے مجتہد کے نزدیک
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس کی بیوی شدید مریض ہونے کے باعث مباشرت کے قابل نہ
رہی ہو وہ کبھی کبھی طوائف کے کوٹھے پر ہو آیا کرے یا کوئی داشتہ رکھ لے۔ مجبوری اور
اضطرار کے الفاظ کئی منھ والے سانپ جیسے قرآن نے فَمَنِ اضْطُرَّ کے ساتھ لَا بَاغٍ
وَّلَا عَادٍ کی شرط لگائی ہے۔ یہ باغیانہ ذہن نہیں تو اور کیا ہے کہ طلاق دو تین دو اور کہو
پڑی ایک۔ ہم تو حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے فتوے کا یہی مطلب سمجھے ہیں کہ جب
دیہاتی رجوع ہی کر چکا تو جائے جہنّم میں۔ کیوں اس کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت برباد کرتے ہو

دوسرا فتویٰ مولانا فرنگی محلی کا ہے۔ اس میں انھوں نے یہی تو کہا ہے کہ "جب
عورت کی علیحدگی دشوار ہو اور مفاسدِ زائدہ کا احتمال ہو تو کسی اور امام کی تقلید کر لے تو
کچھ مضائقہ نہیں۔"

تو کیا آپ "اور امام" کا مصداق ابن تیمیہؒ اور ابن قیّمؒ کو بھی سمجھتے ہیں؟ —
نہیں کم سے کم مولانا موصوف کا یہ مطلب نہیں بلکہ مراد ہیں وہ چار امام جن کے مذاہب
مقبولِ اُمّت ہوئے۔ ثبوت ان کی مراد کا یہ ہے کہ بطورِ نظیر وہ نکاحِ زوجِ مفقود
اور عدّتِ ممتدّ الطہر کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حنفیہ عند الضرورۃ قولِ امام مالکؒ
پر عمل کر لینے کو درست سمجھتے ہیں۔ تین طلاقوں کے مسئلہ میں اگر مذکورہ چاروں اماموں
میں سے کسی ایک بھی امام کا مذہب ایک پڑنے کا ہو تو بے شک یہ فتویٰ آپ کے لئے

معنی ہوگا لیکن جب معلوم ہے کہ چاروں امام تین پڑ جانے پر متفق ہیں تو کیا ملا آپکو
اس فتوے سے؟

تیسرا فتویٰ کسی حبیب المرسلینؒ صاحب کا ہے۔ ان صاحب نے اہلِ حدیث کو
کافر کہنے یا مقاطعہ وغیرہ کرنے کو منع کیا ہے ٹھیک کیا لیکن ان کے دو دعوے سند اور
ثبوت چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ "بعض سلفِ صالحین اور علمائِ متقدمین میں سے اسکے
بھی (یعنی تین طلاق ایک ہیں کے) قائل ہیں۔" یہ وہی ناقص مطالعے اور خام معلومات کا
افسانہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ جیسا صحابی
بلکہ اس کا قائل تھا کہ خرچ سے زائد جتنا مال ہو سب کا صدقہ کرنا واجب ہے لہٰذا
یہ مسلک اختیار کرنا بھی مضائقہ سے خالی ہے۔ دو چار زاہد عابد قسم کے بزرگ اگر تلاشِ
بسیار کے بعد اوّلین صدیوں میں ایسے مل بھی جائیں جو تین طلاق کو ایک سمجھتے ہوں تو
انہیں علمی فریب خوردگی کا شکار سمجھا جائے گا۔ جھوٹی روایتوں کے نقد کی صلاحیت
ان میں نہ تھی اس لئے دھوکا کھا گئے۔ زہد اور صالحیّت قانون میں حجّت نہیں۔ دو چار
معروف و مسلم مجتہدین اور محدّثین کا نامِ نامی پیش کر کے دکھائیے جب بات
بن سکتی ہے۔

دوسرا یہ دعویٰ بھی سند اور نقل کا محتاج ہے کہ ائمّہ اربعہؒ کو چھوڑ کر کسی بھی صالح
عالم کی تقلید ہی کر لو حنفی ہی رہو گے یہ محض زبان زوری ہے۔ لطف یہ ہے کہ مفتی صاحب
اسی سانس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ "فقہائے حنفیہؒ نے بوجہ شدّتِ ضرورت کے
دوسرے امام کے قول پر عمل کر لینے کو جائز رکھا ہے۔" حنفیہؒ کے اس معروف
قول میں تو "دوسرے امام" سے مراد چاروں معروف ائمّہ میں سے کوئی نہ
کوئی ہوا کرتا ہے۔ یہ قول بھلا اس کی دلیل کیسے بن گیا کہ چاروں ائمّہ کو چھوڑ کر
کسی بھی عالم کے قول پر عمل کر ڈالو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔

فتووں کے بعد آپ نے مولانا اشرف علیؒ کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے
"حیلۂ ناجزہ" میں نکاح مفقود الزّوج کے سلسلے میں امام مالکؒ کے مسلک پر
فتویٰ دیا اور معترضین کو جواب دیا کہ تم تقلید کو لئے پھرتے ہو یہاں سرے سے اسلام
ہی جا رہا ہے۔ اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:۔

"درحقیقت ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ شریعت کی مصلحتِ کُلّی کو باقی رکھنے کے لئے کسی خاص امام کی تقلید ترک کر کے دوسرے امام کی رائے پر عمل درست ہے"

بڑی کوفت ہوتی ہے جب کوئی بحث کرنے والا بحث کے ابتدائی آداب تک کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ محترم بزرگ! دعویٰ آپ یہ کر رہے ہیں کہ ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر بھی کسی اور غیر معروف وغیر مُسلّم عالم وزاہد کے فتوے پر بوقتِ ضرورت عمل جائز ہے مگر دلائل وہ لا رہے ہیں جن سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے جس امام کے فتوے پر عمل جائز ہوگا وہ معروف چاروں اماموں ہی میں سے کوئی ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ چاروں امام تو کسی مسئلے میں متفق الرّائے ہوں اور آپ بوقتِ ضرورت ان چاروں کے خلاف رائے پر عمل کریں۔ ایک بھی دلیل آپ نے دعوے کے مطابق نہیں دی۔

ہماری عاجزانہ نصیحت بہت غور سے سنیے۔ طلباء کو پڑھا دینا یا نجی طور پر کچھ فتوے دے دینا تو الگ بات ہے۔ جو چاہے اُڑا دیجئے کون پکڑتا ہے لیکن جب کسی معرکۃ الآرا مسئلہ میں اجتہاد کا تاج سر پر رکھ کر میدان میں تشریف لائیں تو تفقہ، تبحرِ علمی، تحقیق اور معقولیت کے ہتھیار ساتھ لائیں یہ نہیں کہ دس پانچ کتابوں کے ورق اُلٹے اور کاٹ چھانٹ کے عبارتیں اٹھا لیں۔

آں جناب کچھ دلائل کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ان کی تصریحات سے معلوم ہوا۔ ـــ "تین طلاق بیک وقت معصیّت ہے تو کیوں نہ ایسی معصیت کے روکنے کا انتظام کیا جائے اور اس کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے۔"

جزاک اللہ۔ یہ ہے سمجھداری کی بات کہ غلط کام کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں مگر سمجھداری میں آپ نے عقل دشمنی بھی شامل کر دی۔ بہت ہی محترم دوست! جرائم کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ارتکاب ہی نہ ہو سکے۔ ضرور کوئی ایسی ترکیب کیجئے کہ بہو دے لوگ بیک وقت تین طلاقیں نہ دے سکیں لیکن روکنے کا یہ مطلب لینا کہ جرم واقع ہو جائے تو اس کے وقوع اور اثر سے انکار کر دو حیرت خیز منطق ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ لوگ کثرت سے وِہسکی اور ٹھرّا وغیرہ پینے لگیں تو اصلاح کی ترکیب آپ یہ بتائیں

ان مشروبات کو شراب ہی نہ مانو۔ یا سود کے بارے میں یہ مشورہ دیں کہ اس کا نام نفع رکھ دو۔ ربوٰ ہرگز مت کہو۔ دینے والے نے تین طلاقیں دے دیں۔ آپ مشورہ دے رہے ہیں کہ تین مانو ہی مت۔ ایک مانو یہی ترکیب ہے معصیّت سے روکنے کی! ـــ کیسی مضحکہ خیز ہے یہ نکتہ سنجی! آدمی پہلے تولے پھر بولے۔

اور عجیب بات ہے کہ بعض احکام کو بدلنے اور زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں تو آپ کو علّامہ شامیؒ فورًا یاد آتے ہیں اور آپ ان کی بعض ایسی عبارتیں نقل کر دیتے ہیں جو عام اصولی انداز کی ہیں مگر طلاقِ ثلٰث کی بحث میں انھوں نے صریحاً اور جزماً جو کچھ کہا ہے اس پر ذرا توجہ نہیں کرتے۔ رَدُّ المُحتار جلد ۲ ص۵۷۷ کھول کر دیکھئے علّامہ شامیؒ کیا فرما رہے ہیں:۔ وہ فرما رہے ہیں

"وذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعدهم ـــ تا۔ فهو خلافٌ لا اختلاف (از راہِ اختصار عربی عبارت حذف ہے) یعنی جملہ صحابہؓ، تمام تابعینؒ اور ان کے بعد کے ائمۃُ المسلمینؒ اس پر متفق ہیں کہ تین اکٹھی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اجماع تو بالکل ظاہر ہے۔ ایک یوں کہ جب حضرت عمرؓ نے تین طلاق کے حکم کو نشر کیا تو کسی بھی صحابیؓ نے اس سے مطلق اختلاف نہیں ظاہر کیا اور ایک لاکھ صحابہؓ میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف ثابت نہیں۔ لہٰذا اجماعِ سکوتی متحقّق ہو گیا۔ دوسرے یوں کہ اجماع میں مجتہدین کی آراء کا اعتبار ہے۔ ایک لاکھ صحابہؓ میں مجتہد صحابہؓ کی تعداد بیس سے اُوپر نہیں پہنچتی مثلاً فلاں اور فلاں (یہاں شامیؒ نے نام دیئے ہیں) دیگر صحابہؓ فتوے کے لئے ـــ ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان میں سے اکثر کا فتویٰ تین طلاق کے وقوع کا صاف صاف موجود ہے اور اس کے خلاف ایک بھی فتویٰ موجود نہیں تو اب حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حاکم و قاضی اگر تین طلاق کے ایک ہونے کا فیصلہ دے گا تو شرعاً یہ نافذ نہ ہوگا کیوں کہ اجماعی مسائل میں کسی کے اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ ایسا اجتہاد اختلافِ رائے نہیں کہلائے گا بلکہ حکمِ شرعی کی مخالفت کا ہم معنی سمجھا جائے گا۔"

تو محترم! یہ ہے ابنِ عابدین شامیؒ کی دو ٹوک رائے زیرِ بحث مسئلہ میں

اب اگر دوسری طرح کے مسائل کے سلسلہ میں وہ اختلافِ رائے اور تغیّر و تبدّل کے کچھ قواعد بیان کرتے ہیں تو انھیں اٹکل پچّو طلاقِ ثلٰث پر چپاں کر دینا عقل کی وہ قسم ہے جسے گستاخی معاف مسخراپن یا دھینگا مشتی ہی کہا جا سکتا ہے۔ علامہ شامی اگر واقعی آپ کی نگاہ میں اس درجے کے آدمی تھے کہ ان کے قول کو بطورِ حجّت لایا جائے اور ان سے رہنمائی حاصل کی جائے تو پھر ان کی غیر متعلّق بحثوں کو کھینچ تان کر اپنے مطلب بنانے کے بجائے دیانتدار طالبینِ حق کی طرح ان کے دوٹوک فیصلوں اور فتووں کو مرکزِ توجّہ بنایا جائے۔ جی چاہتا ہے کہ خود آپ ہی کے الفاظ علامہ شامی کے بارے میں نقل کر دیئے جائیں:۔

"فقہ کی دنیا میں علامہ شامیؒ کو کون نہیں جانتا۔ عالمِ اسلامی میں جو شہرت اور مقبولیت ان کو حاصل ہوئی اس سے شاید کوئی دوسرا بہرہ ور ہو۔ انھوں نے خاص اسی عنوان پر (یعنی وقتی و زمانی ضرورتوں کے پیشِ نظر بعض مجتہدین کو چھوڑ کر دوسرے مجتہدین کی رائے پر فتویٰ دینا) ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے نشر العرف فی بناءِ بعض الاحکام علی العرف۔ اسمیں علامہ نے بڑی تفصیل سے ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن میں عرف اور مصلحت نیز زمانے کے تقاضوں کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ایک زمانے میں حرام اور ممنوع تھے مگر دوسرے زمانہ میں وہ ایک شدید ضرورت بن گئے لہٰذا ان کا حکم بدل گیا۔"

ٹھیریئے۔ کیا اس کتاب میں شامیؒ نے زیرِ بحث طلاقِ ثلٰث کا بھی ذکر کیا؟ ہرگز نہیں کیا۔ اس مسئلے میں ان کی جو قطعی رائے ہے وہ یہی ہے جو ہم نے رَدّ المختار سے نقل کی۔ اب آپ سوچیئے۔ جو علامہ شامیؒ خود آپ کے نزدیک اصولِ فقہ کے ماہر ہوں، عرف و مصلحت کی بنا پر فتویٰ تبدیل کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ بعض حالتوں میں ضروری سمجھتے ہوں اور خوب جانتے ہوں کہ کس قسم کے مسائل تبدیلی کی گنجائش رکھتے ہیں، اور کس قسم کے نہیں۔ وہی اگر تین طلاق کے مسئلہ کو اس حد تک طے شدہ قرار دے رہے ہوں کہ اس کے خلاف قول کرنا گمراہی قرار پایا ہے۔ اور حاکم کا فیصلہ تک اس کے خلاف نافذ و مقبول نہ ہو تو کیا اس سے بداہتہً یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ ایک اتنے بڑے ماہرِ فن اور اُستادِ اصول کے نزدیک بھی تین طلاق کے وقوع کا اجماعی فیصلہ ان فیصلوں میں نہیں ہے جنھیں عرف و مصلحت کے تحت بدلا جا سکے۔ اب یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی کہ آپ یا کوئی بھی بزرگ علامہ شامیؒ کی قبر پر کھڑے ہو کر یوں فرمائیں کہ اے فقیہِ شام! تو نے تغیّر و تبدّل کے جو قواعد بیان کئے وہ تو ہمیں دل و جان سے قبول اور ان کی حد تک ہم تجھے استاد اور مقتدا مانتے ہیں لیکن ان کے اطلاق سے طلاقِ ثلٰث والے مسئلے کو خارج کر دینا تیرا وہ غیر دانشمندانہ فعل ہے جس کی ہم مذمّت کرتے ہیں۔ اور بلا تکلّف تیرے ہی قواعد کی تلوار سے اس کا سر قلم کئے دیتے ہیں!

صدرِ اوّل میں تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی تھیں۔ اس کے تعلق سے آپ نے فرمایا:۔

"ہمارے احناف بھی مثلاً قہستانیؒ اور طحطاویؒ، درّ مختار ص۱۰۵ جلد دوم کے حاشیہ میں اس کو نقل فرماتے ہیں۔ جامع الرموز ص۳۲۱ اور مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر ص۳۲۸ میں قریب قریب وہی الفاظ ہیں۔"

گرامی قدر! اس طرح کی رعب انگیز موشگافیاں عوام کو تو بے شک مغالطے دے سکتی ہیں لیکن اہلِ علم کے لئے ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ عام پڑھنے والے سمجھیں گے دو نام تو آپ نے علماءِ احناف کے لئے۔ قہستانیؒ اور طحطاویؒ۔ اور تین کتابوں کے حوالے دیئے۔ درِ مختار۔ جامع الرّموز اور مجمع الأنہر۔ اس طرح پانچ شہادتیں اپنے حق میں لے آئے۔ لیکن کیا واقعی یہ گنتی درست ہے؟

آپ خوب جانتے ہیں کہ جامع الرموز جس کا اصلی نام شرح مختصر الوقایہ ہے قہستانیؒ ہی کی ہے۔ لہٰذا قہستانیؒ کا نام اگر بطورِ گواہ پیش کرنا ہی تھا تو مصنف جامع الرموز کی حیثیت سے کرتے۔ طحطاویؒ کے دوش بدوش ذکر کرنا دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک تو یہ کہ دُرِ مختار کے حاشیہ نگار نہیں ہیں حالانکہ آپ کی عبارت سے ہر قاری یہ سمجھے گا کہ طحطاویؒ کی طرح قہستانیؒ بھی دُرِ مختار کے حاشیہ نگار ہیں۔ دوسرے یہ کہ الگ ذکر کرنے سے گواہوں میں خواہ مخواہ ایک نام بڑھ گیا۔

پھر آپ نے یہ بھی تحقیق نہ کی کہ قہستانیؒ چیز کیا ہیں۔ حالاں کہ جس اونچی سطح کی بحث ہے

اس کا تقاضہ تھا کہ غیر ثقہ فقیہوں کا ذکر تک نہ کیا جاتا۔ آپ اپنے مقالہ میں مولانا عبدالحی کی عُمْدَةُ الرِّعَايَة سے ایک عبارت نقل فرما رہے ہیں۔ ذرا اسی کتاب کا مقدمہ ص۱۷ بھی ملاحظہ ہو۔ مولانا عبدالحیٔ قہستانیؒ کی جامعُ الرموز کو غیر معتبر کتابوں میں شامل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ والقهستانی کجارف سَيْلٍ وحاطب لَيْلٍ خصُوصًا استنادہ إلی کتب الزّاهد المعتزلی یعنی قہستانی کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو الابلا سبب واسطہ رکھتا اور اندھیرے میں لکڑیاں جمع کرتا ہو خصوصًا اس کی یہ حرکت تو بہت ہی رُسوا کن ہے کہ وہ زاہد معتزلی کی کتابوں سے حُجّت پکڑتا ہے۔

اور یہ بھی یہیں دیکھ لیجئے کہ یہ بات انھوں نے علامہ شامی کی تَنْقِيحُ الْفَتَاوىٰ الْحَامِدِيَّه سے نقل کی۔ یہ وہی علامہ شامیؒ ہیں جن کی عظمت و ثقاہت پر خود آپ نے گواہی دی ہے۔

اور مشہور حنفی عالم مُلّا علی قاریؒ نے شَمُّ الْعَوَارِضِ فِي ذمِّ الرَّوَافِضِ میں کیا فرمایا ہے اس پر بھی نگاہِ عبرت ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عصام الدّینؒ نے قہستانیؒ کے بارے میں یہ بات صحیح کہی کہ وہ شیخ الاسلام ہرویؒ کے ادنیٰ شاگردوں میں بھی شامل نہیں چہ جائیکہ اعلیٰ شاگردوں میں شمولیت کا دعویٰ قابلِ التفات ہو وَاِنَّمَا كَانَ دَلَّالُ الْكُتُبِ فِيْ زَمَانِهٖ اسے مصنّف بھی مت کہو وہ تو کتابوں کا دلّال ہے وَلَا كَانَ يُعْرَفُ بِالْفِقْهِ الخ اپنے ہم چشموں میں اسے کوئی بھی فقیہ نہیں سمجھتا تھا اور اس حقیقت حال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے اپنی اسی شرح میں (یعنی شرح مختصر الوقایہ میں جو جامع الرموز کے نام سے مشہور ہے) فاسد و غیر فاسد اور صحیح و ضعیف سبھی کچھ بغیر تحقیق کے جمع کر دیا ہے۔ فهو کحاطب اللیل الجامع بین الرطب والیابس فی اللیل (پس وہ تو حاطب اللیل ہے۔ اندھیرے میں الابلا جمع کرنے والا")

کیا کسی بالغ نظر عالم کو زیب دے سکتا ہے کہ وہ اس طرح کے کھوٹے سکّے بازارِ علم و تحقیق میں لائے اور طحطاویؒ کے برابر اُس شخص کو احناف کے نمائندے کی حیثیت سے کھڑا کرے جو کسی بھی شمار قطار میں نہیں ہے۔

اب آئیے طحطاوی کی طرف۔ بے شک انھوں نے طاؤس والی روایت سپُردِ قلم کی ہے لیکن کس سیاق میں۔ کیا آپ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ شیعوں اور ظاہریوں کے مسلک کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اس روایت سے حجّت پکڑتے ہیں۔ اور کیا آپ نہیں دیکھ سکتے کہ چند ہی سطور بعد انھوں نے بحر سے وہی اجماع والی بات نقل کی ہے جو ہم ردالمختار سے نقل کر آئے۔ یعنی تین طلاقوں کے وقوع پر اجماع ہے اس سے اختلافِ رائے جائز نہیں۔

صورتِ واقعہ کی یہ تصویر اور آں جناب کی اپنی کھینچی ہوئی لفظی تصویر کس قدر مختلف ہے۔ رہی مجمع الانہر۔ تو مکرم دوست! یہ کوئی مستقل بالذات اصل تو ہے نہیں بلکہ مختلف متون کا مجموعہ کہیئے۔ اس کی گواہی کم و بیش ایسی ہی ہے جیسے آپ ایک دستاویز بطورِ شہادت پیش کر کے اسی کی کاربن کاپی (مثنیٰ) دوسری شہادت کی حیثیت سے پیش فرما دیں۔ بتائیے کیا یہ دُو شہادتیں ہوں گی؟

سب سے بڑا ستم یہ کہ آپ مسئلہ کی نوعیّت ہی کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ گفتگو ہے احادیث کی۔ اجماعِ صحابہؓ کی۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے ائمہؒ اور فقہاءؒ کی۔ آپ لا رہے ہیں آٹھ سو اور نو سو اور دس سو برس بعد کی نقلیں۔ یہ قہستانیؒ نویں صدی کے آدمی ہیں۔ طحطاوی اور دُرِّ مختار کے مصنّف حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ سب بعد کی شخصیتیں ہیں۔ یہ حضرات اگر واقعتًا اختلاف بھی کرتے تو اجماعِ صحابہؓ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا لیکن لطف تو یہ ہے کہ یہ سب ٹھیک وہی اجماعی مسلک رکھتے ہیں جس کی آپ جڑ کھود رہے ہیں۔ پھر اسے شعبدہ بازی کے سوا اور کیا کہیں گے کہ ان کے فیصلے اور حاصل کو تو آپ چھُپا جائیں اور دورانِ بحث کے چند فقرے اُکھیڑ لائیں۔

مَولانا شمس پیرزادہ توجُّہ فرمائیں

(۱) قرآن نے کہا: ــــــــ "اے نبیؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو عِدّت کے لئے طلاق دو اور عدّت کو شمار کرو۔

اسے پیش کر کے آپ فرماتے ہیں:۔

"عدّت کے لئے طلاق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت طلاق دی جائے جبکہ عدّت کا آغاز ہو سکے۔ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دیتا ہے وہ عدّت کا لحاظ نہیں کرتا کیوں کہ پہلی طلاق دیتے ہی عدّت شروع ہو گئی لیکن دوسری اور تیسری طلاق میں عدّت کا لحاظ نہیں رہا۔ حالانکہ ہر طلاق کے لئے عدّت کا لحاظ ضروری ہے"

ہمارا خیال ہے کہ آپ آیت کا مدّعا سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ غور کیجئے ایک شخص طہر میں بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے پھر طلاق دیڈالتا ہے۔ عدّت کا آغاز اسی وقت ہو جائے گا۔ آغاز میں کسی بھی طرح کا ابہام نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آیت کی رُو سے یہ فعل مطلق گناہ نہ ہوا حالانکہ آیت کا صحیح مدّعا سمجھا جائے تو یہ فعل بھی گناہ قرار پاتا ہے اور گناہ سے خالی فقط یہ طریقہ طلاق ہے کہ جس طُہر میں مباشرت نہ کرے اس میں طلاق دے۔ تفصیل یہ ہے کہ اگر حیض میں طلاق دو گے تو عورت غریب کو غیر ضروری طور پر نسبتاً زیادہ عدّت گزارنی ہو گی کیونکہ جس حیض میں طلاق دی ہے اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ گزُر چکا ہے۔ عدّت کا زمانہ ازروئے قرآن تین حیض ہے۔ اگر اس حیض کو عدّت میں شمار کر کے مزید دُو حیضوں پر عدّت تمام کر دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پورے تین حیض نہ ہو سکے۔ لہٰذا اس حیض کو اور اسکے بعد کے طہُر کو چھوڑ کر اگلے حیض سے عدّت شمار ہو گی۔ اس طرح عورت پر عدّت طویل ہو جائیگی اسی طرح اگر طہُر میں صُحبت کے بعد طلاق دی تو یہ بات مشکوک رہے گی کہ عورت کو کتنی عدّت گذارنی ہے۔ کون جانے کہ اس صحبت سے حمل کی بنیاد پڑ چکی ہو۔ اور بجائے تین حیض کے عورت کو بچّے کی پیدائش تک عدّت گذارنی پڑے۔ لہٰذا اس وقت طلاق دینا کچھ نہ کچھ عرصہ تک عدّت کو مشکوک رکھے گا اور آیت کے تحت یہ شکل بھی ناپسندیدہ قرار پائے گی۔ دیکھ لیجئے اس میں عدّت کا آغاز تو ذرا بھی مشتبہ نہیں پھر بھی آیت نے اس سے منع فرمایا۔

خوب سمجھ لیجئے آیت کے دُو مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ طلاق کے وقت عدّت کا معاملہ مشکوک نہ رہے دوسرے یہ کہ عورت غریب کو مشروع وقت سے زیادہ عدّت نہ گذارنی پڑے۔

اب غور کیجئے اپنے ارشادِ گرامی پر۔ اوّل تو آپ نے خواہ مخواہ تین طلاقوں کی ایک ہی صورت متعیّن کر لی یعنی یہ کہ تین الگ الگ طلاقیں۔ حالاں کہ اگر تین طلاقیں

بیک فقرہ صراحتِ عدد کے ساتھ دی جائیں تو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ پہلی طلاق سے عدّت شروع ہو گئی اور دوسری تیسری میں عدّت کا لحاظ نہ رہا۔ یہاں تینوں ایک ساتھ واقع ہوئی ہیں اور ان تین کی بنا پر نہ تو عدّت میں کوئی اشتباہ پیدا ہوا نہ اس کی مدّت بڑھی۔ پھر مذکورہ آیت سے اس کا ٹکراؤ کیسے ہو سکتا ہے۔

رہی آپ کی فرض کردہ صورت۔ یعنی تین طلاقیں تین الگ الگ فقروں میں دیں۔ تو یہ بھی آیت سے متصادم نہیں۔ پہلا ہی فقرہ ادا ہونے کے بعد عدّت کا زمانہ شروع ہو گیا۔ اب دُوسرا اور تیسرا فقرہ طلاق کی نوعیت میں تو تبدیلی کر رہا ہے لیکن عدّت پر اس کا کیا اثر پڑا۔ عدّت کا زمانہ تو وہی رہا جو پہلے فقرے سے شروع ہوا تھا۔ اور اشتباہ بھی کسی نوع کا پیدا نہیں ہوا۔ فی الحقیقت آپ کا یہ فقرہ بے معنیٰ ہے کہ " دوسری اور تیسری طلاق میں عدّت کا لحاظ نہیں رہا"۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک طلاق کے بعد جب دوسری دی جاتی ہے تو عدّت کا زمانہ دوسری سے شروع ہوتا ہے اور پہلی کے بعد جو زمانہ دوسری تک گزرا ہے وہ سوخت ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس غلط فہمی کی اصلاح کر لیجئے۔ ایک دینے کے بعد اگر رجوع کر لیا اور پھر کچھ دن بعد دوسری دی تو بے شک دوسری سے عدّت کا آغاز ہو گا لیکن رجوع کئے بغیر دوسری اور تیسری دیتا ہے تو چاہے کم وقفہ سے دے چاہے زیادہ وقفہ سے۔ عدّت کا شمار بہر حال پہلی ہی طلاق سے ہو گا اور تین حیض گذرنے پر عورت آزاد ہو جائے گی۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ مذکورہ آیت کی مخالفت اُس صورت میں ہوتی ہے جب طلاق حیض میں دی جائے یا اُس طہُر میں جس میں صحبت کر لی گئی۔ یہ طلاق ایک ہو یا تین ہوں عدّت کے رُخ سے یکساں بات ہے۔ ایک دُو تین کے فرق سے اس آیت کا کوئی تعلّق نہیں۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حکم عدولی کرے گا جب بھی طلاق پڑ جائیگی کیوں کہ عبداللہ ابن عمرؓ نے حیض میں طلاق دی تھی اور رسُولُ اللہؐ نے اسے واقع مانا تھا۔

(۲) اللہ نے فرمایا ——— " جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدّت پوری ہونے کو آجائے تو بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو"

اس آیت کو نقل کر کے آپ نے فرمایا:۔

" یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ جب مدّت پوری ہو رہی ہو تو بھلے طریقے پر روکا جا سکتا

طلاق دے دینے سے بھی حقِ رجوع ختم ہو جائے گا۔ آپ کا خانہ زاد معارضہ اس شرعی فیصلے میں آخر کیسے حائل ہو سکتا ہے۔؟

---

(۳) آپ بخاری سے رفاعۃؓ القرظی والی روایت نقل کرتے ہیں جس میں رفاعہؓ کی بیوی نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا ہے کہ شوہر نے مجھے طلاقِ بَتّہ دے ڈالی ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین طلاقوں کا فیصلہ دے دیا۔ اس پر ہم بحث کر چکے۔ یہاں مزید کہنا یہ ہے کہ اس روایت کو آپ نے اس لئے مجمل قرار دیا ہے کہ اس میں طلاقِ بَتّہ کی بات کہی گئی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اس سے مراد تین الگ الگ طلاقیں ہیں کیوں کہ مسلم شریف میں اس کی وضاحت آگئی ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"صحیح مسلم کی حدیث طلاق کی نوعیت کو واضح کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں وطلّقها آخر ثلٰث تطليقات (مسلم۔ کتاب الطلاق)۔"

ہم بڑی دردمندی کے ساتھ آپ سے ایک بات پوچھتے ہیں۔ کیا واقعی آپ کو پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے محبت ہے؟۔ کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ فنِ حدیث زندہ رہے؟ اور اس میں حماقت و جہالت کو دراندازی کا موقع نہ ملے۔؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو ایک اور سوال کا جواب عطا فرمائیں کہ کیا علمِ حدیث اسی طرح زندہ رہ سکتا ہے کہ آپ جیسا حدیث کا شیدائی جب ایک تحقیقی مقالہ لکھنے بیٹھے اور اس میں حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دیانتدارانہ ترجمانی و تنقیح کا مرحلہ آئے تو آپ اصل کتاب دیکھے بغیر اِدھر اُدھر سے جو جی چاہے حوالۂ قلم فرمادیں؟ کھول کر بھی نہ دیکھیں کہ اُس کتاب میں کیا لکھا ہے جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں۔

سُنیئے محترم دوست! آپ کے ارشادِ گرامی کا مطلب یہی تو ہوا کہ بخاری کی روایت میں رفاعہؓ کی بیوی نے اگرچہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) سے یہ عرض کیا ہے کہ میرے شوہر نے مجھے طلاقِ بَتّہ دی تھی۔ لیکن مسلم شریف کی روایت میں یہ وضاحت آگئی ہے کہ... رفاعہؓ کی بیوی کو تین طلاقوں میں کی آخری طلاق دی گئی تھی جس سے پتہ چلا کہ اکٹھی تین

طلاقیں نہیں دی گئیں تھیں لہٰذا یہ استدلال صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اکٹھی طلاقوں کو مغلظہ قرار دیا۔!

اب مسلم شریف کھول کر بغور ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں امام مسلم رحؒ نے سرے سے رفاعہؓ کی بیوی کا قصّہ لیا ہی نہیں ہے۔ اس قضیہ کی کوئی اچھی بُری روایت ہی مسلم شریف میں موجود نہیں کہ اس کے الفاظ کی بحث پیدا ہو۔ قصّہ ہے تو فاطمہ بنتِ قیسؓ کی طلاق ہے۔ اس کی ہی ۱۴ روایتوں میں ایک روایت کے اندر راوی نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں جنھیں آپ نے نقل فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس کا تو کوئی تعلق رفاعہ قرظیؓ والے قصّے سے ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا خود انصاف فرمایا جائے کہ بہ ایں شانِ ذمّہ داری آپ جیسے نکو نام محبّانِ حدیث فنِ حدیث میں گفتگو کریں گے تو اس غریب فن کا کیا حُلیہ بنے گا؟ یعنی حد ہے کہ مسلم میں سرے سے کوئی روایت ہی زیرِ بحث قصّے کی موجود نہیں اور آپ استدلال کر رہے ہیں اس کے ایک خاص جملے سے!

پھر یہ جو آپ نے مزید تحریر فرمایا کہ ——— ابنِ حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے تین یکجائی طلاقوں پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔" یہ بھی اس اعتبار سے غلط ہے کہ ابنِ حجرؒ کی تمام تر گفتگو صرف بخاری کے تعلق سے ہے مُسلم سے اس کا کوئی تعلق نہیں

ہم بتائیں ابنِ حجرؒ نے کہاں کیا لکھا ہے جسے آپ نہ جانے کہاں سے بے جوڑ نقل فرما رہے ہیں۔ بخاری کا باب ہے اذا طلقها ثلاثا ثم تزوجت الخ (کتاب الطلاق) اس کے ذیل میں یہی رفاعہؓ کی بیوی والی حدیث بیان ہوئی ہے۔ اس میں اس عورت کا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بارگاہ میں یہ بیان منقول ہے کہ "مجھے میرے شوہر رفاعہؓ نے طلاقِ بَتّہ دے دی تھی اس پر میں نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ وہ نامرد نکلا۔ اب میں کیا کروں۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ جب تک دوسرے شوہر سے تمہارا جنسی تعلق قائم نہ ہو جائے رفاعہؓ سے نکاح نہیں کرسکتیں۔"

اس روایت کو جمہورِ اُمّت نے بجا طور پر اس بات کی دلیل بنایا کہ ایک وقت اور ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں نہ کہ ایک۔ ابنِ حجرؒ کو آپ لوگ فرشتہ یا پیغمبر نہ سمجھیں۔ ان سے استدلال کی جوہری نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی اور انھوں نے

تحریر فرمایا:۔

وھو عجب ممن استدل بہ فان البتۃ بمعنی القطع والمراد بہ قطع العصمۃ واعم من ان یکون بالثلاث مجموعۃ اولوقوع الثالثۃ التی ھی آخر تطلیقات (فتح الباری جلد ۹، ص۳۱۲)

عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اس روایت سے تین طلاقوں کا استدلال کرتے ہیں۔ حالاں کہ لفظ بتّہ کے معنی کاٹنے کے ہیں اور طلاق بتّہ سے مراد ہے عصمت کا کٹ جانا اور اس کا اطلاق دونوں ہی شکلوں پر ہو سکتا ہے یہ کہ اکٹھی تین طلاقیں دی گئی ہوں یا دو دیکر تیسری بعد میں ڈالی گئی ہو۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

⁂ ⁂ ⁂

یہاں ابن حجرؒ کا ایک سہو تو یہ ہے کہ وہ محاورے کو نظر انداز کر کے ڈکشنری کھول بیٹھے۔ طلاقِ بتّہ خود ان کے علم میں ہے کہ تین بدعی طلاقوں کو کہا جاتا تھا یعنی جو خلافِ سُنّت طریقے پر دی گئی ہوں اور طریقِ سُنّت پر دی ہوئی تین طلاق لِلسُّنّۃ کہلاتی تھیں۔ چنانچہ احادیثِ صحیحہ کی قدیم ترین کتاب مؤطا امام مالکؒ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں بابُ طلاقُ البتّۃ کے تحت آپ کو ایک بھی روایت طلاقِ سُنّت کی نہیں ملے گی۔ بلکہ ساری روایتیں طلاقِ بدعی کی نظر آئیں گی۔ یہی حال ترمذی اور بعض دیگر کتب کا ہے لہٰذا یہ مانتے ہوئے بھی کہ طلاقِ بتّہ کا اطلاق اکٹھی تین طلاقوں پر بھی ہو سکتا ہے اور الگ الگ فقروں یا وقتوں میں دی ہوئی طلاقوں پر بھی جمہورِ اُمّت کا استدلال اپنی جگہ بے غبار ہے۔ اس پر ابنِ حجرؒ کا حیرت کرنا غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ رفاعہؓ نے تین طلاق ایک فقرے میں دی ہوں یا متعدّد فقروں میں۔ ایک مجلس میں دی ہوں یا چند مجلسوں میں یہ بہرحال طلاقِ سُنّت نہیں تھی طلاقِ بدعی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طلاقِ مغلظہ ہی قرار دیا لہٰذا جمہور کا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ تین بدعی طلاقیں بھی تین ہی ہوتی ہیں۔

دوسرا سہو ابنِ حجرؒ کا یہ ہے کہ بخاری کی بتّہ والی روایت میں خود عورت کا بیان ضمیرِ متکلّم میں ہے۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اِنَّ رفاعَۃَ طلّقنی طلاقی (مجھے میرے شوہر رفاعہؓ نے طلاقِ بتّہ دی تھی)۔ اب ابنِ حجرؒ ہی کی

تصریح کے مطابق اس کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں۔ یہ کہ اکٹھی تین دی ہوں یا الگ الگ دی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالکل نہیں پوچھتے کہ تمھارا مطلب کیا ہے۔ نہیں مطالبہ کرتے کہ اس ذُومفہوم والے لفظ کا ایک مفہوم متعین کرو۔ اس مجمل اور ذو معنیٰ لفظ ہی پر تین کے وقوع کا فیصلہ صادر فرما دینا کھلا ثبوت ہے اس حقیقت کا کہ تین پڑنے کے لئے اکٹھے اور الگ الگ کا فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اہمیت تین کی ہے وہ پڑ کر رہیں گی خواہ اکٹھی دو یا الگ الگ۔

رہی بخاری کی دوسری روایت جس میں خود عورت کا بیان نہیں ہے بلکہ کسی راوی نے اپنے الفاظ میں یوں کہا ہے کہ وطلقھا آخر ثلٰث تطلیقات تو صاف ظاہر ہے کہ راوی نے اپنے دماغ سے عورت کے استعمال کردہ لفظِ بتّہ کی شرح کر دی ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس شرعی فقرے کا مطلب یہ ہے کہ "اس نے آخر تک تین طلاقیں دیدیں" یہ نہیں کہ دو پہلے دی تھیں اور ایک بعد میں۔ لیکن ابنِ حجرؒ یا آپ اس مطلب کو نہ مانیں اور جو چاہے مطلب نکالتے رہیں مگر یہ تو کھُلی بات ہے کہ یہ مطلب اور یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نہیں پہنچے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو طلاقِ بتّہ کی بات کہی گئی تھی اور اسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح طلب کئے بغیر تین کا فیصلہ سنا دیا تھا حیرت یہاں ابنِ حجرؒ کا حق نہیں ہمارا حق ہے۔ ہمیں حیرت کرنے دیجئے کہ جمہورِ اُمّت کے اس قدر مضبوط اور بے غبار استدلال کی لطافت کو ابنِ حجرؒ اتفاقاً نہ سمجھ سکے اور بدگمانی کر بیٹھے کہ استدلال کا مدار گویا بس اس بات پر ہے کہ لفظِ بتّہ کے معنیٰ اکٹھی تین طلاقیں لے لئے جائیں۔

آپ لوگ بظاہر غیر مقلّد ہیں۔ ذاتی اجتہاد کا بڑا زور شور آپ لوگوں کے یہاں ہے مگر ہمیں تو بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم مقلّدوں سے بھی بڑھ کر آپ بعض شخصیتوں کے رُعب میں آجاتے ہیں۔ مثلاً یہی ابنِ تیمیہؒ، ابنِ قیمؒ اور شوکانیؒ جیسے حضرات اور ضرورت پڑنے پر ابنِ حجرؒ بھی آپ کے یہاں حرفِ آخر بن جاتے ہیں۔

(۴) آپ نے رقم فرمایا:۔ "علماء و فقہاء کی ایک تعداد صرف ایک طلاق کے وقوع کی قائل ہے۔ مثلاً حضرت ابنِ عباسؓ، طاؤسؒ، عکرمہؒ، ابنِ اسحاقؒ، امام رازیؒ امام ابن تیمیہؒ، علامہ ابنِ قیمؒ داؤد ظاہریؒ وغیرہ۔

پہلا ہی نام آپ نے اُس صحابیِ رسولؐ ابنِ عباسؓ کا لے دیا جس کے ایک دو نہیں متعدد فتوے تین واقع ہونے کے احادیثِ صحیحہ میں موجود ہیں اور جیسا کہ ہم نے نقل کیا خود امام تی[illegible] برملا تسلیم کرتے ہیں کہ تین واقع ہونے کا فتویٰ دیگر صحابہؓ کی طرح حضرت ابنِ عباسؓ سے بھی بلا شک ثابت ہے۔ آپ تمام ذخیرۂ احادیث میں کمزور سند سے بھی ابنِ عباسؓ کا کوئی فتویٰ ایسا نہیں دکھلا سکتے نہ اور کوئی آج تک دکھلا سکا ہے کہ ایک وقت کی تین صریح طلاقوں کو انھوں نے ایک قرار دیا ہو۔

اس کے باوجود ابنِ عباسؓ کو ڈنکے کی چوٹ ان فقہاء کی فہرست میں گنوا دینا جو ایک کے وقوع کے قائل ہیں ایسی غلط بیانی ہے جس کے بارے میں کوئی اچھّی تاویل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا واقعی غلط بیانیوں سے بھی علمُ الحدیث اور قانونِ شریعت کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے؟۔

امام رازیؒ، ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ کو ایک طرف رکھیے۔ یہ دورِ رسالتؐ سے ساتؔ آٹھؔ سو برس بعد تشریف لانے والے حضرات ہیں۔ گفتگو خیر القرون کے اجماع میں ہے۔ طاؤسؒ، عکرمہؒ اور ابن اسحاقؒ — ان تینوں کے سلسلہ میں فرداً فرداً ہماری معروضات سنیئے۔ اگر واقعی وہ تین اکھٹی طلاقوں کو ایک مانتے تھے تو ان کے دوچار فتوے اس سلسلہ میں بھی موجود ہونے چاہئیں۔ آپ اگر اپنے دعوے میں سچے ہیں تو دوچار نہیں صرف ایک فتویٰ ان کا سندِ صحیح سے ایسا نقل کر دیجئے جس میں ان کی یہ رائے صاف صاف موجود ہو۔ جہاں تک روایتِ حدیث کا تعلّق ہے تو ہم ثابت کر چکے کہ مسلم کی روایت سنداً و متناً دونوں اعتبار سے مضطرب ہے لہٰذا اس کا حوالہ قطعاً بے کار رہے گا۔ علاوہ ازیں آپ حضرات ابنِ قیمؒ سمیت یہ استدلال دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں کہ ابنِ عباسؓ کا فتویٰ اگرچہ تین طلاق واقع ہو جانے کا ہے۔ لیکن ان کی روایت تو ایک واقع ہو جانے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود آپ کے نزدیک روایت اور فتویٰ دوؔ مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ راوی کی روایت کو اس کا فتویٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا مسلم والی روایت کو قبول کر لینے پر بھی آپ اسے طاؤسؒ کا فتویٰ قرار نہیں دے سکتے۔ ہم طاؤس کا فتویٰ چاہتے ہیں تاکہ آپ کے دعوے میں کچھ جان پڑے۔

رہے عکرمہؒ تو بے شک وہ ذی مرتبہ تابعی تھے لیکن آپ کو شاید علم نہیں ان کے بارے میں متعدد اہلِ نظر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ طرزِ فکر میں وہ خوارج سے مطابقت رکھتے تھے۔ چنانچہ امام مالکؒ، اور امام مسلمؒ ان سے کافی بدگمان ہیں۔ خوارج کو روایتِ حدیث میں تو بہت سے اساتذۂ فن نے معتبر مانا ہے اور ماننا بھی چاہیئے جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہی آدمی کافر ہو جاتا ہے وہ بھلا جھوٹ کیوں بولیں گے جب کہ جھوٹ کبیرہ گناہ ہے۔ نقل اور خبر کے معاملے میں انھیں سچّا متصوّر کر لینا معقولیت سے بعید نہیں۔ لیکن فقہ اور فتوے کا تعلّق اندازِ فکر سے ہوا کرتا ہے خوارج کا اندازِ فکر آپ کو معلوم ہی ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تحکیم منظور کی تو ان لوگوں نے قرآن کی آیت اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے تحت حضرت علیؓ کو کافر قرار دیدیا۔ اسی طرح ان کے بہتیرے واہی عقائد ہیں جن کی بنا پر جمہورِ اُمّت انھیں باطِل فرقہ قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی فقہ یا فتوے کو لائقِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ عکرمہؒ کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا دل سے گھڑ کر نہیں کہا آپ ذہبی کی تذکرۃُ الحُفّاظ جلد اوّل ص۹۶ (قدیم ایڈیشن) ملاحظہ فرمالیں۔ جب یہ صورتِ حال ہے تو روایت کی حد تک مستند ہونے کے باوجود عکرمہؒ کی کوئی فقہی رائے اور فتویٰ اگر اہلِ سُنّت اساتذہ اور معروف مجتہدین و ائمہؒ کی رائے اور فیصلے کے صریحاً خلاف ہو تو اس کی آخر کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ اس سے حجّت پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ کل آپ متعہ کی حرمت کو بھی اجماعی نہیں مانیں گے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کے خلیفۂ راشد ہونے کو بھی مشکوک و مختلف فیہ قرار دیں گے اور ختمِ نبوّت میں بھی شبہ ڈالیں گے۔

بایں ہمہ ہمارے عزیز دوست! آپ عکرمہؒ کا کوئی واضح فتویٰ نقل کریں تاکہ یہ تو ثابت ہو کہ آپ کے دعوٰں کی کوئی اچھّی بری بنیاد موجود ہے۔

تیسرے بزرگ ہیں ابنِ اسحاقؒ جنھیں آپ نے اپنا ہم مسلک شمار کرایا۔ کیا آنجناب نے کبھی کسی اسماءُ الرجال کی کتاب میں ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایا؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ امامِ فقہ ہونا تو بعد کی بات ہے سچّے اور جھوٹے ہونے کے رُخ سے بھی اُن کی شخصیت متفق علیہ نہیں۔

ہم نقل کر آئے ہیں کہ امام مالکؒ انھیں دجّالوں میں کا ایک دجّال کہتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ اگر میں بیت اللہ میں بھی ان کے جھوٹے ہونے کا حلف اٹھاؤں تو کو
مضائقہ نہیں۔ اسی طرح بعض اور اکابر ان پر بڑی جرحیں کرتے ہیں اور ان کی اصل م
حیثیت صرف داستان سرائی کی حد تک ہے یعنی "امام المغازی" —— قانون شر
میں ان کی رائے اور فتوے کی ہرگز یہ حیثیت نہیں مانی گئی کہ صحابہؓ اور اجل تابعینؒ
مقابلے میں یہ لائقِ ذکر سمجھے جائیں۔

خوب سمجھ لیجیے۔ طاؤسؒ کا بھی باوجود دلائل کے زہد و ورع اور کثرتِ تحدیث
اجتہاد میں یہ درجہ تسلیم نہیں کیا گیا کہ جب ایک طرف صحابہؓ اور فقیہ تابعینؒ کی آرا
ہوں تو ان کے بالمقابل ان کی کسی فقہی رائے اور اجتہاد کا ذکر بھی کیا جائے چہ جائ
اس کی کوئی قابلِ لحاظ اہمیت ہو۔

حاصل یہ کہ اوّل تو طاؤسؒ، عکرمہؒ اور ابنِ اسحاقؒ کے ایسے صریح فتوے ہما
علم کی حد تک سندِ صحیح سے منقول ہیں ہی نہیں جن کی بناپر دعویٰ کیا جا سکے کہ یہ تین طلا
ایک ہونے کا فتویٰ صادر کیا کرتے تھے لیکن اگر آپ کھود کر کہیں سے ایک آ
فتویٰ اٹھا ہی لائیں تو آپ کو کسی مُسلّم اُستادِ فن کی یہ تصدیق بھی دکھلانی ہوگی کہ
فتویٰ اجماع کا قاطع بن سکتا ہے۔ علمی وفنّی مسائل میں محض زہد یا کثرتِ تحدیث
اعتبار نہیں یہاں مجتہدین لائقِ التفات ہوتے ہیں۔ اجتہاد مذاق نہیں ہر مجتہد اپنا ایک
الگ مکتبِ فکر (اسکول آف تھاٹ) بناتا ہے۔ اس کے اپنے کچھ اصول و مبانی
ہوتے ہیں۔ طاؤسؒ، عکرمہؒ اور ابنِ اسحاقؒ کے نفقہ اور اجتہاد نے کوئی مکتبِ فکر
پیدا نہیں کیا۔ ان کی حیثیتیں فقہ اور فتوے میں ناقل کی ہیں مجتہد کی نہیں۔ ان کی نقل اگر
جاننے پہچاننے مجتہدین اور ائمہؒ و اساتذہؒ کے خلاف ہو تو جمہورِ علمائے اُمت اسے شاذ
منکر کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

اب آئیے اس آخری نام کی طرف جو آپ نے لیا۔ یعنی داؤد ظاہریؒ۔

اے بہت ہی پیارے دوست! یہ آپ نے بہت ہی بھول پن کا مظاہرہ کیا
داؤد ظاہریؒ اور اُن علمار کی صف میں جن کی تقلید کی جاتی ہے! —— یہ تو عجوبہ ہوا
کاش آپ اس شخص داؤد الاصبہانی کے حالات اور عقائد جاننے کے لیے کتابیں

دیکھتے۔ یہ شخص قیاس کا منکر تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ زمین اور آسمان اور انفس و
آفاق میں توحیدِ باری کی کوئی دلیل نہیں۔ ابو بکر رازی الفصول فی الاصول میں اسکے
متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا شمار ان بر خود غلط اور بدعقل لوگوں میں
ہے جنھیں نہ اصولِ شریعت کا ادراک نہ اجتہاد کے طریقوں کی خبر۔ بعض علومِ عقلیہ میں
اس کی شہرت کے باوجود فقہ اور احکامِ شریعت میں اس کی حیثیت عالم کی نہیں عامی کی ہے
محمد بن معین کی دِراساتُ اللبیب سے بھی مختصراً اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔
حالاں کہ انھوں نے ظاہریہ کی طرف سے دفاع کیا ہے حملہ نہیں کیا۔

علامہ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ کتاب وسُنّت کی روشنی میں داؤد کا مذہب مردود ہے
اس کے اقوال کسی بھی اجماعِ اہلِ سُنّت کے قاطع نہیں ہو سکتے۔ بعض اہلِ اصول کے
نزدیک ظاھریّہ کے اختلافِ خیال کی حیثیت اختلاف کی نہیں بغاوت کی ہے۔
انحراف کی ہے۔

امام الحرمین ابو بکر بن العربیؒ العواصم والقواصم میں ظاہریّہ کے بارے میں اظہارِ
خیال فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہلِ مرکّب میں گرفتار ہیں۔ ایسی فضول باتیں کرتے ہیں
جو سمجھ سے بالاتر ہیں۔ خوارج کی طرح آیات واحادیث کو غلط محمل پر اُتارتے ہیں۔
ابنِ حزم ظاہری (صاحبِ محلّٰی) نے اگرچہ اپنے آپ کو نسبتاً سنبھال لیا۔ اور
بجائے داؤد کی تقلیدِ جامد کے خود مجتہد بن بیٹھے۔ لیکن وُسعتِ علمی اور ذہانت کے باوجود
ان کے قلم سے بے شمار اغلاط کا ترشح ہوا ہے۔ پھر بھی وہ طلاقِ ثلٰث کے مسئلے میں
معلوم ہی ہے کہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ اکھٹی تین طلاقوں کو سُنّت مانتے ہیں
اس طرح بات یہ بنی کہ آپ نے پہلے تو حضرت ابنِ عباسؓ کا نام غلط طور پر لیا۔ پھر چند
غیر ضروری نام شمار کرائے پھر داؤد ظاہری کو یہ جانے بغیر گواہ بنا لائے کہ یہ ہیں کون
ذات شریف۔ آخر یہ کون سا طرزِ استدلال ہے جو آپ دن کی روشنی میں استعمال
فرما رہے ہیں۔ فنِ حدیث اور قانونِ شریعت کو اتنا بے وقعت تو نہ کیجیے کہ فرشتوں کی
آنکھوں میں آنسو آجائیں۔



مولانا اکبر آبادی توجّہ فرمائیں

(۱) آں جناب نے سورۂ بقرہ کی آیت نقل کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

"ان آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلاقِ مغلظ اس وقت واقع ہوگی جب کہ مرد آگے پیچھے دو طلاق دینے کے بعد یہ فیصلہ کرلے کہ اسے اب عورت کو اپنی زوجیت میں نہیں لینا ہے اور اس فیصلہ کے مطابق وہ ایک طلاق اور واقع کردے۔"

پہلا طالب علمانہ سوال یہ ہے کہ فیصلہ کرنے نہ کرنے کی بات آیت میں آخر کہاں کی گ... ہے۔ کوئی ایک حرف ایسا نظر نہیں آتا جس سے اس کے لئے اشارہ ملے۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ انسان جو بھی فعل کرتا ہے ذہنی میلان اور ارادے ہی کے تحت کرتا ہے اسی لئے آیت ارادے اور فیصلے سے کوئی بحث نہیں کرتی بلکہ صاف و سادہ انداز میں بتاتی ہے کہ دُو طلاقوں تک حقِ رجوع ہے۔ تیسری بھی دے دی تو یہ حق ختم۔ د... والے نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہو یا فوری طور پر ارادہ پیدا ہوا ہو۔ اس سے قانون الٰہی کو آخر کیا سروکار ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ فیصلہ کو آپ نے دُو طلاقوں کے بعد پر منحصر کیا حالانکہ ایک شخص پہلی طلاق دیتے ہوئے ہی اگر یہ ارادہ رکھتا ہو کہ تین دوں گا تو آیت میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو اس ارادے کو غیر معتبر ٹھیرادے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زید نے یوں کہا۔ "تجھ پر طلاق۔ تجھ پر طلاق"۔ کیا یہ آگے پیچھے دُو طلاقیں نہیں؟ ـــــ پھر اسی منٹ اس نے تیسری کا فیصلہ کرتے ہوئے تیسری بار یہی فقرہ بول دیا تو خود آپ کی تصریح کے مطابق تین طلاقیں پڑ جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر آخر آپ کا یہ رجحان کیوں ہے کہ اُمّتِ مسلمہ قرآن کی اس صراحت کو نظر انداز کر کے شیخ شلتوت یا ابنِ قیمؒ یا شوکانی یا نواب صدّیق حسنؒ کے پیچھے چل کھڑی ہو۔

(۲) آپ نے تحریر فرمایا:

"اجماعِ صحابہؓ کی نسبت حافظ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق دونوں طرح کی روایات ہیں۔ بعض میں ہے کہ وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور بعض روایات میں اسکے

برعکس یہ ہے کہ وہ طلاقِ مغلّظہ ہونے کا فتویٰ دیتے تھے لیکن زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، عکرمہ، طاؤس، محمد بن اسحاق، فلاس بن عمرو حارث عکلی داؤد بن علی، اور ان کے اکثر اصحاب، بعض اصحابِ مالک، بعض اصحابِ حنفیہ بعض اصحابِ احمد بن حنبلؒ۔ ان سب کا فیصلہ یہ تھا کہ طلاق ثلثہ کا حکم ایک طلاق کا ہے۔"

اس کے لئے آپ نے اعلامُ الموقعین جلد ۲ صفحہ ۱۴ تا ۳۲ کا حوالہ دیا۔ گویا آپنے جو کچھ ابنِ قیمؒ کی طرف منسوب کیا وہ ان کی کسی متعیّن عبارت کا مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً ۱۹ صفحات کو پڑھ کر آپ نے یہ مطالب اخذ کئے ہیں۔ یہ نالائق طالبِ علم آپ سے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ اعلام الموقعین اور اغاثۃ اللّہفان اور زاد المعاد کے متعلّقہ صفحات کو ایک بار پھر پڑھئے اور اپنی رائے کی وکالت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ حق و صداقت کی وکالت کے نقطۂ نظر سے پڑھئے پھر ان شاء اللہ آپ خود محسوس فرمالیں گے کہ ابن قیّمؒ کا مطلب سمجھنے میں آپ سے صریح غلطی ہوئی ہے۔

اِغاثۃ اٹھائیے۔ اس کے صفحہ ۹۷ پر آپ کو ابن قیّمؒ کے یہ الفاظ ملیں گے:

"فقد صح بلا شك عن ابن مسعودؓ وعلی وابن عباسؓ الالزام بالثلاث ان اوقعها جملة"

(یس بلا کسی ریب و شک کے یہ بات تو قطعی طور پر مسلّم ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ اکٹھی دی ہوئی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے تھے۔)

اب فرمائیے! اگر عبداللہ ابن مسعودؓ اور عبداللہ ابنِ عبّاسؓ سے ابنِ قیّمؒ کی دانست میں دونوں طرح کی روایات ثابت ہوتیں تو وہ کس طرح یہ فقرہ لکھتے۔ آپ دیکھ رہے ہیں صحّ پر حرفِ قَدْ بھی داخل ہے جو علامت ہے جزم و یقین کی۔ پھر بلاشک کے اضافے اس یقین میں اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

ان دُو صحابہ کے علاوہ آپ نے دو مزید صحابیوں کا ذکر کیا۔ زبیر بن عوامؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ مگر ابنِ قیّمؒ تو اسی صفحہ پر مزید یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ سوائے ابنِ عباسؓ کے اور کسی بھی صحابی سے اس قول (یعنی تین اکٹھی طلاقیں ایک ہوتی ہیں) کی

صحیح نقل ہمیں ڈھونڈنے پر بھی نہ مل سکی اسی لئے ہم نے اختلاف کے اسباب میں اس سبب کو شامل نہیں کیا۔

گویا خود ابنِ قیمؒ معترف ہیں کہ فتویٰ تو بلاشبہ ابنِ عباسؓ کا بھی یہی رہا ہے کہ تین تین ہی ہوتی ہیں مگر ایک قول ان کا اس کے خلاف احادیث میں موجود ہے۔ ہم دوسرے صحابہؓ تو ان میں سے کسی کا قول بھی قابلِ اعتماد ذریعہ سے مخالفت میں نہیں ملتا ——— بتائیے! اس واضح اعتراف کے بعد آپ نے ان کے کس فقرے سے یہ مطلب اخذ فرمالیا ہے کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت ابنِ عوفؓ کا فیصلہ تین طلاقوں کے ایک ہونے کا تھا۔

حالانکہ ابنِ قیمؒ اگر ایسا دعویٰ کرتے بھی تو بغیر قوی ثبوت کے وہ قابلِ تسلیم نہ ہوتا لیکن وہ تو اس دعوے کے برخلاف صاف الفاظ میں مذکورہ بالا اعترافات فرما رہے ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے قلم سے منقولہ بالا عبارت نکلنا آپ ہی بتائیے علم و تحقیق اور دیانتِ نقل کے کس خانے میں رکھا جائے گا۔؟

مزید یہ کہ آپ نے اصحاب مالکؒ، اصحاب حنفیہؒ اور بعض اصحاب احمدؒ کا تانتا باندھ دیا۔ بچارے عوام اس لمبی قطار کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ یہ تو بے شمار لوگ تین کو ایک کہنے والے ہیں۔

اے فقیہِ مکرم! دُو ورق پیچھے اُلٹ کر اغاثہ کا صـ۱۷۶ کھول لیں۔ کیا ابن قیمؒ نے یہاں خود یہ تصریح نہیں کردی ہے کہ مالکیہ میں سے تلمسانیؒ وغیرہ اس کو امام مالکؒ کے دو قولوں میں سے ایک قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مالکیہ واضح کرتے ہیں کہ یہ قول امام مالکؒ کا ہرگز نہیں۔ صرف بعض مشائخ کا ہے اور شاذ ہے۔

شاذ کیسے نہ ہو جب کہ موطا امام مالک میں خود امام مالکؒ شدّ و مد سے تین کے تین ہونے کا مسلک ظاہر کر رہے ہیں اور حدیثوں پر حدیثیں اس کے ثبوت میں لا رہے ہیں

اغاثہ کے اسی صفحہ پر اصحاب احمدؒ کے بارے میں بھی ابن قیمؒ کا اپنا اعتراف یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اصحاب احمد ابنِ حنبلؒ کا مصداق ابنِ تیمیہؒ کے دادا ہوں تو ہوں باقی کسی حنبلی کا قول مجھے نہیں مل سکا۔

پھر اے محترم! ابنِ تیمیہؒ کے دادا کی تو منتقی الاخبار اور المحرّر موجود ہے۔

ان میں دیکھ لیجئے وہ جمہورِ اُمّت کی طرح اس مسئلہ پر اجماع کے قائل ہیں اور وہ تین ہی کے واقع ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ تو آخر آپ کا ابنِ قیمؒ کی طرف نسبت کر کے اصحاب مالکؒ اور اصحابِ احمدؒ کو قطار میں کھڑا کر دینا ستم ظریفی کے سوا کیا کہلائے گا۔

رہے "اصحابِ حنفیہؒ"۔ تو یہ بھی مغالطہ انگیزی ہے لے دے کے ایک بزرگ محمد بن مقاتل رازیؒ ملتے ہیں جن کے بارے میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ تین کو ایک مانتے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی بحث طلب ہے۔ اصولِ روایت کی معیاری سطح پر مقاتل کی طرف ایسا انتساب مشکوک ہے۔ دوسرے وہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد نہیں۔ شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ ہزاروں شاگردوں میں اگر کوئی ایک شاگردوں کا شاگرد کسی مسئلہ میں اپنی ایک اینٹ کی مسجد الگ بنالے تو اسے کون اہمیت دے گا۔ مقاتل امامتِ اجتہاد کی مسند پر فائز نہیں تھے۔ ان کی ذاتی رائے کی کیا اہمیت ہے اگر وہ حنفی مدارکِ اجتہاد اور مناہجِ فکر سے ہٹی ہوئی ہو۔ ان کا نام ذہن میں رکھ کر یہ کہنا کہ بعض اصحابِ حنفیہؒ ایسا کہتے ہیں پروپیگنڈے کی تکنک تو ہو سکتی ہے حق پسندانہ علم و تحقیق سے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔

عکرمہؒ، طاؤسؒ اور محمد بن اسحاقؒ کے سلسلے میں ہم کافی شافی گفتگو کر چکے — زبان تو کسی کی نہیں پکڑی جا سکتی مگر ان حضرات کے ناموں کی گردان کئے جانا دھاندلی ہی کہلا سکتا ہے۔

اور یہ حارث عکلیؒ اور داؤد بن علیؒ! ——— یا جامعُ الفضائل! دین سے تمسخر آپ جیسے ذمّہ داروں کو زیب نہیں دیتا۔ کیا یہ نام اس قابل ہیں کہ اجماعِ صحابہؓ و تابعین کے مقابلے پر پیش کئے جائیں۔ اس ترکیب سے تو اسلام کے سارے ہی قوانین کا تیا پانچا کیا جا سکتا ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ اُمّت میں کیسے کیسے ضالّ و مضل فرقے اور کیسے بلید العقل اور مریضُ الفہم افراد گزر چکے ہیں اور آج بھی موجود ہیں ہماری یہ ذمّہ داری نہیں کہ کونے آنتریں سے اٹھا کر جو بھی نام کوئی پیش کر دے اس کے جغرافیہ کی تلاش میں کتبِ رجال میں سر مارتے پھریں۔ ذمّہ داری نام لینے والوں کی ہے وہ پہلے ثابت کریں کہ یہ حضرات واقعی ان اساتذہ میں تھے جن کی رائے اجتہاد و تفقہ

کے میدان میں قابلِ لحاظ بھی سمجھی گئی ہے ۔ اس کے بعد ہی گفتگو آگے بڑھ سکتی ہے بحالتِ موجودہ یہ صرف شعبدہ بازی ہے ۔

مولانا حامد علی توجّہ فرمائیں

آپ نے تحریر فرمایا ہے : "خلال کی کتاب العلل میں اثرم رح سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ رح سے رُکانہ رض کی حدیث البتّہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس کی تضعیف کی ۔"

حدیث رُکانہ رض کے سلسلے میں ابو عبداللہ رح (امام احمد رح) اور بخاری رح وغیرہ کے موقف پر تو ہم مفصّل گفتگو کر آئے ۔ یہاں ایک اور بات عرض کرنی ہے ۔ اثرم رح کون ہیں ، یہ آپ شاید نہ جانتے ہوں ۔ مگر اس نقل سے یہ تو بہر حال ظاہر ہوا کہ ان کی شہادت آپ کے نزدیک کچھ معتبر ہے ۔

تو اب سنیئے ۔ حافظ الجمال بن عبد الہادی الحنبلی اپنی کتاب السیر الحاث فی علم الطلاق الثلاث میں اپنے یعنی امام احمد ابن حنبل رح کے مذہب کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ تین اکھٹی طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں جن کے بعد حلالہ کے بغیر حرمت دور نہیں ہو سکتی یہی ہمارا صحیح مذہب ہے ۔ اور اسی مذہب کو اصحابِ امام احمد رح نے اکثر کتابوں میں جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے خرقی ۔ مقنع ۔ محرّر ۔ ھدایہ وغیرہ اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں الاثرم رح نے بیان کیا کہ میں نے ابو عبداللہ (احمد ابن حنبل رح) سے ابنِ عباس رض والی اس حدیث کے بارے میں جس میں انھوں نے کہا ہے کہ دورِ رسالت اور دورِ صدیقی رض میں تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں ۔ عرض کیا کہ آپ جو اس کے خلاف مذہب رکھتے ہیں تو آپ کے پاس اس حدیث سے گلو خلاصی کا کیا ذریعہ ہے ؟ امام احمد رح نے جواب دیا کہ ہمیں بہتیرے مستند آدمیوں سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ خود ابنِ عباس رض تین اکھٹی طلاقوں کو تین ہی مانتے تھے (پھر ہم کیسے مان لیں کہ وہ ایسا مان سکتے تھے اگر واقعی یہ روایت ان سے ثابت ہوتی ۔)

دیکھا آپ نے ۔ اثرم رح ہی کے ذریعے امام احمد رح کا طرزِ فکر اور فیصلہ کیا ظاہر ہوا ؟ ۔ اور نوٹ کیجئے ۔ امام ترمذی رح کے شیخ اسحٰق بن احمد رح بھی اپنے مسائلِ احمدیہ میں ایسی ہی

بات امام احمد رح سے نقل کرتے ہیں جیسی اثرم رح نے کی ۔ بلکہ یہ بھی نوٹ کیجئے امام احمد رح یہ رائے بھی رکھتے تھے کہ جو شخص تین اکھٹی طلاقوں کے وقوع سے انکار کرے وہ اہلِ سُنّت سے خارج ہوا ۔ مسدد بن مرہد کو امام صاحب نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ من طلق ثلثا فی لفظ واحد فقد جہل وحرمت علیہ زوجتہ ولاتحل لہ ابدًا حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ (جس شخص نے ایک ہی لفظ سے تین طلاقیں دیں اس نے جہالت کا مظاہرہ کیا اور اس پر اس کی بیوی حرام ہو گئی ۔ اب کبھی بھی حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ کسی اور سے نکاح نہ کر لے) اطمینان کے لئے آپ طبقات الحنابلہ میں مسدد بن مرھد کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیں ۔ وہاں آپ کو یہ بھی مل جائے گا کہ قاضی ابو الحسین حنبلی رح نے بھی اسی جواب کو امام احمد رح کی طرف منسوب کیا ہے ۔

مزید برآں یہیں ابو الوفاء ابن عقیل رح حنبلی کے تذکرے میں آپ کو یہ مسئلہ ملے گا کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے یوں کہا اَنتِ طالقٌ ثلثًا اِلاّ طلقتین (تجھ پر دو کم تین طلاق) تب بھی تین طلاقیں پڑ جائیں گی کیونکہ لم یصح استثناء الاکثر ۔

سمجھے آپ :- ؟ ۔ زید نے بیوی سے کہا تو تین طلاق والی ہے مگر فوراً ہی بلا توقف ان تین میں سے دو طلاقوں کا استثنار بھی کر دیا ۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ فقط ایک طلاق پڑے ۔ تین میں سے دو گئیں تو ایک ہی بچی ۔ لیکن حنبلی بزرگ فتویٰ دیتے ہیں کہ ایک نہیں تین پڑیں کیوں کہ مستثنیٰ منہ میں سے استثنار اکثر کا کر دیا گیا (دو کا) جو ما بقیٰ (ایک) سے زائد ہے لہٰذا وہ قبول نہ ہوگا اور تین ہی پڑیں گی ۔

آپ اور وہ لوگ جو مسند احمد سے حدیث رُکانہ رض نقل کر کے عوام کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں سوچیں کہ امام احمد رح کے برعکس کس شدّ و مد سے جمہورِ اُمّت کے ساتھ ہیں ۔ اور کتنی بڑی علمی بددیانتی ہے کہ صاحبِ مسند کا مذہب بالائے طاق رکھ کر مُسند سے وہ روایت اٹھالائی جائے جو اس مذہب سے متصادم ہے اور جس کی بے اساسی اہلِ علم میں معروف ہے ۔

آنجناب نے تحریر فرمایا ہے کہ " امام ابنِ قیّم رح نے بھی اعلام الموقعین میں متعدد صحابہ رض ، تابعین رح ، تبع تابعین رح اور بعد کے علماء کا ذکر کیا ہے جو اس قول کے قائل ہیں ۔ (زندگی ص ۱۲۹)

بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اعلام کی وہ عبارت نقل فرمادیں جس سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکے۔ ہمیں تو ابن قیمؒ کی تمام بحث میں سوائے ابن عباسؓ کے کوئی صحابی نہیں مل سکے جس کے متعلق ابن قیمؒ وثوق سے کہتے ہوں کہ وہ تین طلاقوں کے ایک ہونے کے قائل تھے اس کے برخلاف ہم ابن قیمؒ کا وہ قول نقل کرآئے ہیں کہ سوائے ابن عباسؓ کے کسی بھی صحابی کی طرف اس قول کی نسبت نقلِ صحیح سے ثابت نہیں۔ اور ابن عباسؓ کے بارے میں بھی وہ بلا ابہام تسلیم کرتے ہیں کہ فتویٰ ان کا تین ہی واقع ہونے کا تھا۔

نیز ان تابعین وغیرہ کے بھی اسمارِ گرامی ہم ضرور سننا چاہیں گے جن کا سراغ آپ کو اعلامُ الموقعین میں لگا ہے۔ کاش آپ اپنے ہی تخیلات کی رو میں بہنے کے عوض علمی بردباری سے کام لیتے اور ایسے دعوے نہ کرتے جن کی کوئی اصل نہ ہو۔

علینؒ سے آپ نے جو چند نام گنوائے ان کے بارے میں بھی آپ نے مطلق تحقیق نہیں کی کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مقام وحیثیت کے مالک ہیں۔ اسمار الرجال کے اساتذہ ان کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں اور اجماع کے بالمقابل ان کا نام خم ٹھونک کر لینا کتنی غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ کسی بھی علم وفن میں اہمیت اساتذہ اور ماہرین کی ہوتی ہے نہ کہ عوام اور اطفالِ مکتب کی۔ جو بھی چند نام آپ لوگ دہراتے ہیں ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں جسے متفق علیہ اساتذہ نے مجتہد کا درجہ دیا ہو۔ یہ ابنِ ارطاۃؒ یا ابن اسحٰقؒ یا ابن مقاتلؒ اور یہ طاؤسؒ۔ اوّل تو انکی طرف خلافِ اجماع رائے کا انتساب ہی محتاجِ ثبوت ہے۔ علینؒ ہوں، ابن حجرؒ ہوں، ابنِ تیمیہؒ اور ابن قیمؒ ہوں، یہ صدیوں بعد کے حضرات ہیں۔ انھوں نے اگر شہرۂ عام سے متأثر ہوکر کچھ نام لے ہی دیئے ہیں تو قواعدِ معروفہ کے مطابق لائقِ اعتماد سندوں سے ان کی تصدیق ہونی چاہئے اور معلوم ہونا چاہئے کہ ان حضرات کے کیا الفاظ تھے جنھیں ان کی رائے کا درجہ دیا گیا ہے ہماری تحقیق کی حد تک تو نہ طاؤسؒ کی طرف انتساب صحیح نہ ابنِ اسحاقؒ کی طرف۔

دوسرے اس دعویٰ انتساب کو مان ہی لیا جائے تو آپ ہمیں بتائیں ان میں کون ہے جس کی حیثیت احکامِ شرعی کے میدان میں مجتہد کی ہو۔ ہر اہلِ علم جانتا ہے کہ

ابن اسحاق سچے اور جھوٹے ہونے ہی کے اعتبار سے سخت مختلف فیہ شخصیت ہیں چہ جائیکہ امام فقہ ہوں۔ اور جو لوگ ان کے طرفدار ہیں وہ بھی انھیں بس صاحبُ المغازی ملنتے ہیں یعنی غزوات کی تاریخ بیان کرنے میں ممتاز۔ فقیہ اور مجتہد تو نہیں مانتے حجاج ابن ارطاۃ کا حال یہ ہے کہ اساتذہ کے نزدیک ان میں تدلیس کا عیب ہے۔ انکی روایت بھی غیر مشروط طور پر مقبول نہیں۔ بصرے کے قاضی کی حیثیت میں ان کی طرف رشوتخوری کا بھی انتساب ہے۔ تکبّر کے مریض تھے۔ محلّیٰ اٹھاکر دیکھئے ابن حزمؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ صاحب ساقط الاعتبار ہیں ان کا حال یہ ہے کہ اَلَا بَلا روایتوں سے پرہیز نہیں کرتے اور غلط روایات کے سہارے حقائق ثابتہ پر خاک اڑاتے ہیں۔ زہد وورع بھی ان میں نہیں جو دین میں اجتہاد کی بنیادی شرط ہے۔ ابن مقاتل بھی کوئی مجتہد نہیں۔ بڑے فقیہ نہیں۔ رہے ظاہریہؒ تو ان کے باطل عقائد معروف ومشہور ہیں۔ آپ زیادہ نہیں چند کتابیں دیکھیں:۔ دِرَاسَاتُ اللبیب - العَواصم والقواصم الفصول فی الاصول۔ یہ آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ صحابہؓ اور اجلِ تابعینؒ اور ائمہؒ مشہورہؒ کے اجماع واتفاق کے مقابلے میں کس درجے اور سطح کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے درجے کے لوگوں کو چوٹی کے اساتذہ اور ائمہؒ کے بالمقابل لا کھڑا کرنا علم وتفقّہ سے استہزاء ہے۔

ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ بے شک ایسی قابلیت کے لوگ تھے کہ اگر دورِ تابعینؒ میں ہوتے تو ان کی رائے قابلِ لحاظ سمجھی جاتی اور ان کا اختلاف اجماع کو مشکوک بناتا۔ لیکن آٹھ سو برس کے بعد کے ان مجتہدین کا کوئی بھی اختلافِ رائے بھلا صحابہؓ اور تابعینؒ وغیرہ کے اجماع کا قاطع کیسے ہو سکتا ہے۔ اختلاف کے جو دلائل ان کے پاس ہیں ان میں سے نمایاں اور بنیادی دلائل کی کمزوری ہمارے اس انتقاد میں آپ بغور ملاحظہ فرمائیں اور اگر کوئی اور مضبوط دلیل بچی رہ گئی ہو تو اسے بھی سامنے لائیں۔ حق یہ ہے کہ ان کے بہتیرے تفردات میں یہ بدترین تفرد ہے جسے قابلِ تقلید نہیں سمجھنا چاہیئے خصوصًا ایسے دور میں جب کہ بہتیرے پڑھے لکھے جاہل کتنے ہی اجماعی مسائل کے پیچھے لاٹھی اٹھائے پھر رہے ہیں۔

ابنِ قیمؒ نے تو یہ شوشہ نکالا تھا کہ رکانہؓ والا قصہ ایک نہیں دو ہیں۔ ایک رکانہؓ کا ایک ان کے باپ عبد یزید کا۔ آپ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر فرما رہے ہیں کہ رکانہؓ ہی کے دو واقعے ہیں۔ ایک میں انھوں نے طلاقِ بتّہ دی دوسرے میں تین طلاقیں۔

یقین کیجئے محترم دوست! یہ علم و تحقیق نہیں مکابرہ اور چرب زبانی ہے۔ جہالت فن کا بھونڈہ مظاہرہ ہے۔ یہ اس قابل بھی نہیں کہ فنِ حدیث کا کوئی واقف کار اسکی تردید پر وقت ضائع کرے۔

ہاں اس مقام پر آپ نے مسند احمد والی روایت کے لئے ابنِ تیمیہؒ کی جو تحسین و تصحیح نقل کی ہے اس پر چند لفظ سُن لیں۔ اگرچہ پچھلے نقدِ مفصّل کے بعد اسکی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن تسکینِ دوست کی خاطر چند ساعتوں کا زیاں اور سہی۔

ابنِ تیمیہؒ کا محض یہ کہدینا کہ داؤد بن الحصینؒ (اس روایت کے ایک راوی) امام مالکؒ کے شیوخ میں سے اور بخاریؒ کے رُواۃ میں سے ہیں آخری فیصلہ نہیں کر دیتا۔ ہم پیچھے لکھ آئے ہیں کہ امام بخاریؒ کے استاذ مدینیؒ بھی اور امام داؤدؒ بھی تنبیہ کر چکے ہیں۔ نیز بعض اور اساتذہ بھی اس تنبیہ میں ان کے ساتھ ہیں کہ داؤد بن الحصینؒ جب عکرمہؒ سے روایت کریں تو ہرگز اعتماد مت کرو۔ یہ داؤد بن الحصین خارجی تھے کُھلم کُھلا اپنے مسلک کی دعوت دیتے تھے۔ ابو حاتمؒ کا کہنا ہے کہ اگر امام مالکؒ ان سے روایت نہ کرتے تو کوئی بھی ان سے روایت نہ کرتا یہ قوی نہیں ہیں۔ خود امام مالکؒ ان سے روایت کرنے کی بنا پر کتنے ہی محدّثین کے یہاں نشانۂ اعتراض بنے ہیں۔ ابنِ عُیینہؒ ان کی روایات سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ یہ سب ذہبیؒ کی میزانؒ الاعتدال پر دیکھ لیجئے۔ عکرمہؒ تک کے بارے میں بدعات کا الزام ثبت دوام ہو چکا ہے۔ اسی سند کے ایک راوی ابن اسحاقؒ کا تذکرہ ہم کر چکے۔ وہ قاضی شوکانیؒ بھی جو زیرِ بحث مسئلہ میں آپ کے ساتھی ہیں ان ہی ابن اسحاقؒ کی وجہ سے اس روایت کو نیل الاوطار میں معلول قرار دیتے ہیں۔

یہ سب ہوتے ہوئے ابنِ تیمیہؒ کی تصحیح و تحسین آخر کس منصف مزاج کے نزدیک لائقِ التفات ہو سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ خود امام احمدؒ اپنی نوٹ کردہ

ل نوٹ: "وہ" سے مراد یہ ہے کہ اسے انھوں نے اپنی بیاض میں لکھ لیا تھا۔ "مسند احمد" میں اسے شامل کرنے کی ذمہ داری انکے بیٹے

اس روایت کو ضعیف و غیر مستند قرار دے کر اس کے خلاف مذہب اختیار کئے ہوئے ہیں۔

آپنے "اجماع" کے زیرِ عنوان ابنِ حجرؒ کی وہ عبارت نقل کی جس کا آغاز اس فقرے سے ہوا ہے کہ:-

"ایک مجلس میں تین طلاق کے ایک ہونے کی بات شاذ ہے" (یعنی ناقابلِ قبول)

یہ ابنِ حجرؒ کا اپنا خیال و عقیدہ ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اس خیال کی تردید میں فلاں فلاں باتیں کہی ہیں۔ کن لوگوں نے کہیں اسکی وضاحت نہیں۔ وَاُجیبَ بِاَنّہٗ یعنی صیغۂ مجہول سے جواب شروع کیا گیا ہے۔ اگر آپکا مطالعہ اس موضوع پر وسیع نہیں تھا جب بھی خود اس جواب سے ہی سمجھ سکتے تھے کہ یہ شیعوں اور رافضیوں کا جواب ہے اور آپ جیسے صحیحُ العقیدہ سُنّی کا اسے اپنے حق میں استعمال کرنا انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔ اندازہ کیجئے اس جواب میں حضرت علیؓ، جیسے ابن مسعودؓ، حضرت ابنِ عوفؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے صحابہ کی طرف اس رائے کی نسبت کر دی گئی ہے کہ وہ تین طلاق کو ایک مانتے تھے۔ حالاں کہ جس شخص کے منھ پر آنکھیں ہیں اور حدیث کی معروف کتابیں اس نے دیکھی ہیں وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ افترا پردازی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان صحابہؓ کے متعدد فتوے صحیح و قوی سندوں سے اس کے برعکس موجود و محفوظ ہیں اور ابنِ تیمیہؒ یا ابنِ قیمؒ یا قاضی شوکانیؒ میں سے بھی کوئی اس من گھڑت انتساب کی صحت کا مدّعی نہیں ہے۔

اس کے بعد اس جواب میں ابنِ مغیث اور محمد بن وضاح جیسے بے عیار اور ناقابلِ التفات ناموں کا اندراج ہے (جن کی کچھ حقیقت آگے ہم کھولیں گے) اس کے بعد یہ خلافِ واقعہ بات کہی گئی ہے کہ تین کے ایک ہونے کا قول حضرت ابنِ عباسؓ سے ان کے متعدد شاگردوں نے نقل کیا ہے حالانکہ امام ابو داؤدؒ اور ابن عبدالبرؒ اور ابنِ رجبؒ اور امام احمدؒ اور نہ جانے کتنے اکابر کی تصدیق سامنے آچکی ہے کہ سوائے طاؤس کے ابنِ عباسؓ کا کوئی بھی شاگرد ان سے ایسا نقل نہیں کرتا بلکہ جملہ شاگرد اس کے خلاف نقل کرتے ہیں۔

اس کے بعد محدّث ابنُ التینؒ کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہ ــــ "تین طلاقوں کے پڑ جانے میں کوئی اختلاف نہیں البتہ ان کے گناہ ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے۔" کہا گیا ہے کہ "تعجّب ہے ابن التینؒ پر وہ ایسا کہتے ہیں جب کہ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اختلاف موجود ہے۔"

آپ نے اے محترم دوست! یہ تصوّر فرمالیا کہ تعجّب کا اظہار خود ابنِ حجرؒ کر رہے ہیں اور اسی تصوّر کے تحت آپ نے یہ عبارت نقل بھی فرمائی ہے کہ دیکھ لو اجماع کہاں ہے! خود ابنِ حجرؒ جیسے استاذِ فن اختلاف کو ایک حقیقتِ ثابتہ مان رہے ہیں اور اجماع کے دعوے پر حیرت کر رہے ہیں۔

لیکن فہمِ سلیم استعمال کرتے تو بہ آسانی ادراک فرما لیتے کہ یہ اظہارِ حیرت بھی شیعوں اور رافضیوں ہی کے قول کا ایک حصّہ ہے نہ کہ ابنِ حجرؒ کا اپنا ریمارک۔ اوّل تو اس لئے کہ ابنِ حجرؒ نے جو جواب نقل کیا ہے اس کے مندرجات کو وہ خود بھی واہی تصوّر کرتے ہیں جن کا ثبوت فتح الباری کے اس مقام پر ورق ورق میں موجود ہے۔ وہ کسی ایک بھی صحابیؓ کی طرف اختلاف کی نسبت درست نہیں سمجھتے نہ ابنِ مغیث اور ابن وضاح اور غنوی اور خشنی وغیرہ کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہے۔ نہ اکیلے طاؤسؒ کے سوا ابنِ عبّاسؓ کے کسی بھی شاگرد سے انھوں نے اس روایت کی نقل تسلیم کی ہے اور خاتمۂ کلام پر اجماع کا دعویٰ شدّ و مد سے ثبتِ قرطاس کیا ہے جسے ہم نقل کر آئے۔ فرمائیے اگر وہ خود ابنُ التینؒ کے قول پر تعجب کرتے تو اجماع کے مدعی کیوں ہوتے۔ تعجب کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ اختلاف کا انکار غلط ہے۔ اختلاف موجود رہا ہے۔ یہ بات شیعہ اور رافضی ہی کہتے ہیں۔ ابنِ حجرؒ کہتے تو اجماع کی بات ہی زبان سے نہ نکالتے۔

اب گویا بات یہ بنی کہ آپ فتح الباری کو سمجھے بغیر یا پھر خدانخواستہ قصدًا اس کی غلط ترجمانی کر کے اجماعِ صحابہؓ اور اتفاقِ ائمہؒ کو روافض و شیعہ کے علمِ کلام سے توڑنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کا خلیفۂ راشد ہونا اجماعی مسئلہ نہیں ہے اور ثبوت میں اہلِ سُنّت کی کسی کتاب سے وہ عبارت اٹھا لائیں جس میں صاحبِ کتاب نے شیعوں کا یہ خیال بیان کیا ہو کہ ابوبکرؓ و عمرؓ غاصب تھے

لافت پر حضرت علیؓ کا حق تھا۔ انھوں نے حق تلفی کر کے تختِ خلافت پر قبضہ کر لیا
اگر اس فن کاری سے ابوبکرؓ و عمرؓ کا رُشد تباہ کیا جا سکتا ہے تو بے شک آپ فتح الباری کی مذکورہ عبارت نقل کر کے صحابہؓ اور ائمہؒ پر خاک اڑا سکتے ہیں لیکن اگر یہ طرزِ عمل مذموم ہے تو پھر سُن لیجئے کہ ابنُ التینؒ نے غلط نہیں کہا تھا۔ تین طلاقوں کے بائن ہی ہونے میں صحابہؓ اور ائمۂ سلفؒ اور قدیم مجتہدین و محدّثینؒ کے مابین کوئی بھی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اختلاف ہے تو روافض و شیعہ کا ہے اور انھوں ہی نے غلط پروپیگنڈہ کر کے بعض غیر محقق سُنّی علماء کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہو نہ ہو اختلاف تھا ضرور۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ــــ آپ، دوسرے مقالہ نگار، مصر و شام کے دیگر نو پیدا مجتہدین اور جامعہ ازھر مصر کے محققین کرام سب کو یہ ادنیٰ اور ناچیز طالبِ علم آواز دیتا ہے کہ آپ فقط ایک ہی صحابیؓ کا کوئی فتویٰ نقلِ صحیح سے پیش کر دیں یا ابتدائی دو سو سالوں کے چانے پہچانے فقہائے مجتہدین اور ثقہ محدّثین و مفسرینؒ میں سے کسی ایک کا ہی قولِ صریح دکھلا دیں۔ تب یقینًا آپ کا یہ دعویٰ قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں اختلافی ہے۔ لیکن یہ رطب و یابس جمع کرنا، یہ افسانوی روایات سے کم علموں کو مغالطے دینا، یہ لنگڑے لولے فقیہوں کو بانس کے پیروں پر کھڑا کر کے مخالفین کی صفیں آراستہ کرنا، یہ کاٹ چھانٹ کے عبارتیں اٹھانا، یہ عبارتوں کی غلط ترجمانی کرنا اور فن کے متفق علیہ اصول و مبانی سے لاپروا ہو کر جو چاہے کہہ گزرنا حق پرستی نہیں حق دشمنی ہے۔ اجتہاد نہیں سرکشی ہے۔ فقاہت نہیں زندقہ ہے۔ قانونِ اسلامی بے چارہ آج تلوار سے محروم، یتیم و یسیر پڑا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنے ہی اس سے تمسخر کریں اور کند چھُری سے اس کے اعضاء کاٹیں۔

ابھی ماہ مئی میں ہماری ملاقات مدیرِ "زندگی" سے ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ بعض اہلِ حدیث بزرگوں کے کچھ خیالات چھپنے سے رہ گئے جس پر انھیں شکایت بھی ہے۔ ہم مدیرِ "زندگی" سے گزارش کریں گے کہ وہ یہ مقالے بھی ضرور چھاپیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ زیرِ بحث موضوع پر کیا واقعی کسی کی جھولی میں چند اصلی ہیرے بھی ہیں یا سب کانچ کے ٹکڑے لیے پھر رہے ہیں۔

اَنتِ طَالِقٌ ثلٰثاً بِفَمٍ وَاحِدٍ

ابوداؤد کی ایک روایت میں ایک راوی عِکرمہؒ کے حوالے سے ابن عباسؓ کا یہ قول بیان کرتے ہیں :۔

اذا قال انت طالق ثلثا ۞ جب کسی شخص نے ایک منھ سے تین
بفمٍ واحد فھی واحدہ ۞ بار انتِ طَالِق کہا تو یہ ایک طلاق ہوگی۔

اس کے بارے میں ہم بتا آئے ہیں کہ خود امام ابوداؤدؒ نے اسی جگہ یہ تصریح کردی ہے کہ یہ قول ابن عباسؓ کا نہیں ہے بلکہ عکرمہؒ کا اپنا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ مولانا محفوظ الرحمان بھی اور مولانا حامد علی بھی ابوداؤدؒ کی تصریح سے نظر بچا کر اسے قولِ ابنِ عباسؓ ہی کی حیثیت سے بیان کرتے چلے جارہے ہیں۔

اچھا چلئے مان لیا یہ قولِ ابن عباسؓ ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں یہ دونوں حضرات ناکام رہے ہیں۔ ناکام اس لئے رہے ہیں کہ یہ حضرات احادیث بے لاگ طریقے پر سمجھنا ہی نہیں چاہتے بلکہ اپنے موقف کی وکالت ان کا مقصد ہے ورنہ اتنے کم سمجھ تو نہ تھے کہ کلام کی باریکیوں کا ادراک ہی نہ کرسکیں۔

اس قول کا جو ترجمہ ابھی ہم نے کیا وہ دراصل مولانا حامد علی کا کیا ہوا ہے (زندگی ص۱۳۱) اور صحیح ترجمہ ہے۔ مولانا محفوظ نے بھی ترجمہ غلط نہیں کیا لیکن دونوں محترم یہ ادراک نہیں کرسکے ہیں کہ اس قولِ ابن عباسؓ سے ان کے موقف کی تائید نہیں تردید ہورہی ہے اور جمہور کے مسلک کی تردید نہیں تائید نکل رہی ہے۔

ان دونوں حضرات نے اس قول کو اپنی دانست میں ابنِ عباسؓ کے اس قول کا مؤید اور مرادف سمجھا ہے کہ زمانِ رسالتؐ اور زمانِ صدیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں۔ نیز انھوں نے سمجھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جہاں تین کے تین ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے۔ وہیں تین کے ایک ہونے کا بھی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس قول کو نقل کرنے سے قبل مولانا حامد علی نے یہ تحریر فرمایا:۔

"حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا معروف مسلک تو یہی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو وہ تین طلاق مانتے تھے مگر ان کی طرف یہ قول بھی منسوب ہے، کہ وہ تین طلاق کو ایک طلاق مانتے تھے۔"

جس فقرے پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے وہ اس وکیلانہ ذہنیت کا بہترین ترجمان ہے جس کی ہم نشاندہی کرتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی جو واقعہ اپنے خلاف جارہا ہو اسے خواہ مخواہ بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرنا۔ ابنِ عباسؓ تین کے تین ہی ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے یہ بات اتنے حتمی دلائل سے ثابت ہے کہ کسی کیلئے اس میں مجال انکار نہیں اور ابن قیمؒ تک اس سے انکار نہیں کرسکے ہیں مگر اس حقیقت کو ایک دیانتدار طالب حق کی طرح تسلیم کرنے کے بجائے ہمارے دوست الفاظ ایسے استعمال کررہے ہیں گویا یہ حقیقت مُسلّم نہیں ہے "یہی بیان کیا جاتا ہے" کہہ کر انھوں نے شبہ پیدا کرنے کی نامسعود کوشش کی حالاں کہ وہ سو برس بھی کوشش کریں تو یہ حقیقت مشتبہ نہیں ہوسکتی کہ ابن عباسؓ نے ہمیشہ تین طلاق کے تین ہونے کا فتویٰ دیا۔ محاورے میں شاید اسی کا نام ہے چاند پر خاک اُڑانا۔

خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ ہم اپنے دوستوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ قولِ ابنِ عباسؓ کا مطلب کیا ہے اور اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ جن تین طلاقوں کے تین ہی ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے وہ وہی تین طلاقیں تھیں جو بعض لوگ اپنی بیویوں کو دیا کرتے ہیں یعنی اُن بیویوں کو جو ان کے تصرّف میں ہیں۔ جن سے وہ نہ جانے کتنی بار مباشرت کرچکے ہیں اور یہی طلاقیں آج ہم سب کا موضوعِ بحث بھی ہیں۔ جمہورِ اُمّت کے جس اجماع کی بحث چل رہی ہے اُس کا تعلق اُس خاص شکل سے نہیں ہے جب کوئی شوہر اپنی منکوحہ کو صحبت سے قبل ہی طلاق دے ڈالے۔ جب یہ بات طے اور مسلّم ہے تو اب غور یہ کرنا چاہیے کہ کیا مذکورہ قولِ ابنِ عباسؓ میں ان ہی زیرِ بحث طلاقوں کے ایک ہونے کی بات کہی گئی ہے یا اس قول کا تعلق اس خاص شکل سے ہے جب شوہر منکوحہ کو قبل از صحبت طلاق دے دیتا ہے۔ اگر پہلی

شکل ہو تب تو ہمارے دوستوں کا یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ ابن عبّاسؓ کبھی تین ہونے کا فتویٰ دیدیتے تھے اور کبھی تین کے ایک ہونے کا۔ لیکن اگر دو شکل ہو تو یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے اور بات یہ بنتی ہے کہ زیرِ بحث تین طلاقوں توان کا فتویٰ ہمیشہ تین ہی کا رہا البتّہ باکرہ کی طلاق کے سلسلے میں ان کا یہ تھا کہ اگر "فَمٍ وَاحد" میں تین طلاقیں دی گئیں تو وہ ایک ہوں گی۔ "فم کا مطلب کیا ہے یہ ابھی ہم عرض کرتے ہیں۔ ذرا یہ اچھی طرح ذہن نشیں کر لیا جا باکرہ کی طلاق کے سلسلے میں بھی حضرت ابنِ عباسؓ کا ایک فتویٰ یہ منقول ہے تین پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر تجدیدِ تعلق نہ ہو سکے گی۔ یہیں ابوداؤد با بقیۃ نسخ المراجعۃ میں دیکھئے۔ ابنِ ایاس بن بُکَیر فرماتے ہیں:۔

"ابنِ عباسؓ اور ابو ھُریرہؓ اور ابن عمرو بن العاصؓ تینوں سے اس باکرہ عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا جسے اس کے شوہر نے تین طلاقیں دے دیں تو ان تینوں حضرات نے قرآن کی وہی آیت دہرادی کہ اب یہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دوسرے مرد سے نکاح کر کے پھر طلاق نہ پا جائے۔"

ابنِ عبّاسؓ کا یہی فتویٰ بعض اور روایات میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جو لوگ احادیث کو محض اپنی ہواؤ خواہش کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہوں بلکہ صحیح بات سمجھنا ان کے پیشِ نظر ہو انھیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ سب معاملہ ہے کیا۔ کیا حِبرُ الاُمّۃ حضرت ابنِ عبّاسؓ جیسا صحابی اس قدر غیر ذمّہ دار تھا کہ خود ہی تو یہ بتاتا ہے کہ دورِ رسالتؐ و دورِ صدّیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں اور خود ہی اس کے خلاف تین کے تین ہونے کا فتویٰ دیئے چلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی تو باکرہ کی تین طلاق کے سلسلے میں یوں کہتا ہے کہ وہ ایک ہو گی کبھی کہتا ہے تین ہوں گی۔

ابن قیّمؒ پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ وہ بھی اس معاملہ میں ٹھوکر کھا گئے اور خواہ مخواہ کی نکتہ سنجیاں کر کے ایک صاف و سادہ حقیقت کو مشتبہ اور ناقابلِ فہم بنانے کی سعیِ نامشکور فرمائی۔ بے کم و کاست حقیقت ہم پیچھے بیان کر آئے

یہاں پھر تفہیمِ مزید کی کوشش کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ واضح تین طلاقیں دورِ رسالتؐ اور دورِ صدّیقیؓ میں تین ہی تھیں۔ ایک نہیں تھیں۔ البتّہ تین مبہم طلاقوں میں نیّت کی تحقیق کر لی جاتی تھی۔ جیسا کہ حدیثِ رُکانہؓ میں آپ دیکھ چکے ——— نیز باکرہ کی طلاق میں ایک شکل ایسی تھی کہ تین طلاقوں کو ایک حکم میں مانا جاتا تھا۔ جیسا کہ ابوداؤد میں طاؤسؒ، ابوالصّہباؒ کے حوالہ سے ابنِ عبّاسؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:۔

"کوئی آدمی جب منکوحہ کو خلوت سے قبل تین طلاق دیتا تھا تو عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صدّیقیؓ اور عہدِ عمرؓ کے ابتدائی ایّام میں وہ ایک ہی مانی جاتی تھی مگر جب عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ بار بار یہ حرکت کرنے لگے ہیں تو انھوں نے حکم جاری کیا کہ اب یہ تین تین ہی مانی جائیں گی۔"

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ باکرہ کی تین طلاقوں کا ایک ہونا مسلّمات میں سے ہے لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کس طرح ممکن تھا کہ ابن عبّاسؓ اور ابو ہریرہؓ اور ابنُ العاصؓ جیسے وسیع العلم صحابہ کسی بھی حالت میں یہ فتویٰ دے سکتے کہ باکرہ کی تین طلاقیں مغلّظہ ہوتی ہیں۔ بدعقلی تو اس نکتہ کو نظر انداز کر سکتی ہے لیکن عقلِ سلیم ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتی۔ عقلِ سلیم کو صاف نظر آ رہا ہے کہ تین طلاق دینے کی دُو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شوہر نے کہا "تجھ پر تین طلاق" دوسری یہ کہ اس نے کہا "تجھ پر طلاق تجھ پر طلاق تجھ پر طلاق"

پھر اس دوسری شکل کی بھی دُو نوعیّتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلسل بغیر رُکے یہ فقرہ کہا گیا ہو اور دوسری یہ کہ ایک بار اَنتِ طَالِقٌ (تجھ پر طلاق) کہا پھر رُک گیا۔ منٹ بھر بعد پھر کہا اور رُک گیا۔ منٹ بھر بعد تیسری بار کہدیا۔ "منٹ" تمثیلاً عرض کیا گیا ورنہ مقصد یہ ہے کہ اَنتِ طالِقٌ کو تین بار کہنے میں تھوڑا سا زمانی فصل واقع ہوا۔

اب سمجھئے۔ باکرہ کے سلسلے میں جہاں کہیں ابنِ عبّاسؓ یا دیگر صحابہؓ نے تین واقع ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہاں پہلی شکل درپیش ہے جب کہ شوہر نے تین کے عدد سے بیک فقرہ تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس شکل میں یہ حضرات تین واقع ہو جانے پر متفق ہیں۔ اور جہاں ابنِ عبّاسؓ یا دیگر صحابہؓ یہ کہتے ہیں کہ

بلکہ صریح طور پر " اسے " کا مصداق باکرہ کی تین طلاقیں ہیں لہٰذا واضح ہوگیا کہ ہما[illegible]
دوست کو یا تو حدیث کا فہم ہی نہیں رکھتے یا خواہ مخواہ دھینگا مشتی کئے چلے جا رہے ہیں۔

اور یہ بھی سن لیجئے، طاؤسؒ نے بھی جھوٹی قسم نہیں کھائی ۔ امام زہریؒ [illegible]
ابن عباسؓ وغیرہ کے جس فتوے کا ذکر کیا وہ دراصل اس شکل سے متعلق تھا جب باکرہ[illegible]
عدد کی صراحت سے بیک فقرہ تین طلاقیں دی جائیں ۔ آپ معلوم ہی کر چکے کہ اس
شکل میں تینوں واقع ہو جاتی ہیں لیکن یہ صراحت اس وقت طاؤسؒ کے سا[illegible]
نہیں آئی تھی اور انھیں معلوم تھا کہ اگر کوئی شخص باکرہ بیوی سے تین بار اَنتِ طالق
کہے تو چاہے ایک ہی منہ میں کہے مگر ابن عباسؓ اسے ایک طلاق مانتے تھے ۔ لہٰذا ا[illegible]
انھوں نے اس بات کو دہرایا ۔ وہ بھی سچے تھے اور امام زہریؒ بھی سچے تھے ۔ فر[illegible]
سمجھنے کا رہا ۔ جن حضرات کا مطالعہ وسیع ہے وہ جانتے ہیں کہ مدخولہ کی طلاق کے
بارے میں جملہ صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ تین چاہے اکٹھی دو، چاہے الگ الگ
تین ہی پڑیں گی ۔ اور غیر مدخولہ کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ اکٹھی دو تو تین پڑیں
الگ الگ دو تو ایک ہی پڑے گی ۔ مدخولہ کے مسئلہ میں تو کسی بھی قابلِ ذکر شخصیت نے ا[illegible]
نہیں کیا البتہ غیر مدخولہ کے سلسلے میں کچھ اختلاف منقول ہے ۔ بعض کہتے ہیں غیر مدخولہ پ[illegible]
صورت میں ایک ہی پڑے گی ۔ بعض کہتے ہیں ہر صورت میں تین پڑیں گی ۔ اہلِ مدینہ اور
اور اوزاعیؒ اور ابن ابی لیلےؒ کی یہ رائے منقول ہے کہ باکرہ کو اَنتِ طالِق تین بار ایک ہی [illegible]
میں کہا تب بھی تین ہی پڑیں گی البتہ ایک منہ میں نہ کہے بلکہ درمیان میں کچھ رک جا[illegible]
تب ایک پڑے گی ۔

اس تفصیل سے بتانا یہ مقصود ہے کہ باکرہ کے سلسلہ میں شروع ہی سے یہ صورت چلی
آرہی ہے کہ تین طلاقیں ایک شکل میں تین مانی جاتی ہیں اور ایک شکل میں ایک ۔ اب اس
بے خبری کا کیا علاج ہے کہ لوگ قرار واقعی مطالعہ تو کریں نہیں اور جو باتیں ابن عباس[illegible]
طاؤسؒ یا کسی اور نے طلاقِ باکرہ کے سلسلہ میں کہیں ہوں انھیں غیر باکرہ کے زیرِ بحث مسئلے [illegible]
جوڑ دیں اور خود بھی گمراہ ہوں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں ۔ غضب یہ ہے کہ مسلم اور ابو داؤ[illegible]
دونوں میں طاؤسؒ کی مفصل روایت میں وضاحت بھی آگئی ہے کہ ابن عباسؓ ان تین
طلاقوں کا ذکر کر رہے ہیں جو باکرہ کو دی گئی ہوں (قبل ان یدخل بھا [illegible] سے پہلے یعنی بیوی [illegible]

صحبت کی گئی ہو) لیکن یہ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا پھر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے
اس مفصل روایت کو چھپا جاتے ہیں اور اسی واقعے کی مجمل و مختصر روایات سے فقرے
اٹھا کر یہ غلط دعویٰ کرتے ہیں کہ دیکھئے ابن عباسؓ نے بھی تین طلاقوں کو ایک مان لیا ۔ حالانکہ
دنیا بھر کا مسلّم قاعدہ ہے کہ مجمل کا حال مفصل سے معلوم کرنا چاہئے ۔ صحیح بات مفصل ہی سے
معلوم ہوگی ۔ اور مجمل کا کوئی ایسا مفہوم اخذ کرنا غلط ہوگا جو مفصل کے خلاف ہو ۔

دلیلِ مزید

اور تھوڑا سنئے

ابوداؤد میں بسندِ صحیح یہ روایت موجود ہے اور اسے ہم پیچھے بھی بیان کر آئے ہیں ۔ اور
مولانا مودودی نے بھی اسے تفہیم میں لیا ہے کہ ایک شخص ابن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے
بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں ۔ ابن عباسؓ نے اس پر فرمایا کہ کیا تماشا ہے ۔ تم میں سے ایک
شخص حماقت کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور پھر چیختا ہے کہ یا ابنِ عباسؓ یا ابنِ عباسؓ!
حالانکہ وہ اللہ سے نہیں ڈرا ۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اسی کے لئے اللہ خلاصی کا دروازہ
کھولتا ہے ۔ میں تیرے لئے یہ دروازہ کہاں سے کھولوں جب کہ تو اللہ سے ڈرا ہی نہیں ۔ تیری
بیوی تجھ سے چھوٹ گئی اور تو گناہ گار بھی ہوا ۔

اب ذرا ابنِ قیمؒ کے مقلد مقالہ نگار حضرات جواب تو دیں کہ اگر واقعی ابن عباسؓ کے
علم میں یہ بات تھی کہ دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھیں ۔ تو
ابنِ عباسؓ نے یہ جواب کیسے دیا ۔ انھیں تو قدرتاً یہ جواب دینا چاہئے تھا کہ اگرچہ تو نے بیک وقت
تین دے کر اللہ کی نافرمانی کی ہے ۔ لیکن شکر کر کہ تیرے لئے اللہ اور رسولؐ نے دروازہ کھلا رکھا ہے
رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صدیقِ اکبرؓ تین کو ایک ہی مانا کرتے تھے ۔ لہٰذا جا بیوی سے رجوع
کر لے ۔ ایک ہی طلاق پڑی ہے تین نہیں ۔

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص صحبت سے پہلے بیوی کو تین طلاقیں
دے بیٹھا اور مسئلہ پوچھنے ابنِ عباسؓ کے پاس آیا ۔ ابن عباسؓ نے خود فتویٰ دینے کے بجائے
اُسے ابوہریرہؓ کے سامنے کر دیا ۔ اور ابوہریرہؓ سے کہا کہ جناب یہ شخص ایک بڑی پیچیدگی میں
پھنس گیا ہے آپ اسے فتویٰ دیجئے ۔ (یَا اَبَاهُرَيْرَةَ قَدْ جَاءَتْكَ مُعْضِلَةٌ)

بتایا جائے کہ اگر ابنِ عباسؓ کے علم میں یہ بات تھی کہ دورِ رسالت میں تین طلاقیں ایک ہی ہوتی تھیں تو پھر انھیں فتویٰ دینے میں تأمل کیوں ہوا اور کون سی پیچیدگی نظر آگئی تھی جس کا حوالہ انھوں نے دیا۔ اس صورت میں تو ان کا سیدھا اور صاف جواب یہی ہونا چاہئے تھا کہ "میاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی شکل میں ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین مانتے ہی نہیں تھے ایک مانتے تھے لہٰذا تمھاری زوجہ پر بھی ایک ہی پڑی۔ جاؤ اسے راضی کرکے دوبارہ نکاح کرلو۔"

موٹی سی بات ہے کہ ابوھریرہؓ سے تو یہ منقول ہے ہی نہیں کہ دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہی مانی جاتی تھیں۔ یہ تو بقول فریقِ ثانی صرف ابن عباسؓ سے منقول ہے لہٰذا اور بھی ضروری اور قدرتی تھا کہ ابن عباسؓ سائل کو ابوہریرہؓ پر معلّق نہ کرتے بلکہ خود فتویٰ دیتے۔

اسی طرح مؤطا میں بیان شدہ عبداللہ ابن مسعودؓ کا فتویٰ ہے (جس کا ذکر آچکا) یہ کہ سو طلاقیں دے کر ایک شخص نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انھوں نے کہا دوسرے لوگ کیا کہتے ہیں۔ سائل بولا وہ کہتے ہیں کہ تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی۔ ابن مسعودؓ نے جواب دیا، لوگ سچ کہتے ہیں۔ مسئلہ یوں ہی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے اللہ کے ہدایت کردہ طریقے پر طلاق دی اس کا تو حکم اللہ نے بیان کردیا لیکن جس شخص نے خود اپنے کو اشتباہ میں پھانس لیا ہم اسے اسی اشتباہ کے حوالہ کریں گے یہ نہیں ہوسکتا کہ اشتباہ میں تو پڑو تم اور اسے لادیں ہم اپنے اُوپر۔

ہمارے دوست بتائیں اگر واقعی دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ میں تین طلاقیں ایک ہی ہوا کرتی تھیں تو کیا یہ کوئی ایسا راز تھا جس سے نہ تو ابوہریرہؓ جیسا کثیر الصحبت بلکہ محاورۃً یوں کہئے کہ دُم سے لگا ہوا صحابیؓ واقف نہ ابن مسعودؓ واقف۔ ابوہریرہؓ کا فتویٰ آپ سن ہی چکے تین واقع ہونے کا ہے۔ اب عبداللہ ابن مسعودؓ بھی یہی کہہ رہے ہیں حالاں کہ اگر دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ والا مفروضہ صحیح ہوتا تو یقیناً ابن مسعودؓ کا جواب سائل کو یہ ہونا چاہئے تھا کہ لوگوں نے تجھے غلط مسئلہ بتایا۔ اللہ کے رسولؐ ایک وقت کی تین اور چار سب طلاقوں کو ایک ہی مانا کرتے تھے اور تو نے جو حرکت کی ہے اس سے کسی بھی طرح کا اشتباہ پیدا نہیں ہوا۔ جا ایک طلاق پڑی ہے بیوی سے رجوع کرلے۔

اسی طرح حدیث کا یہ واقعہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے سلسلے میں جس نے قبلِ صحبت بیوی کو بیک فقرہ تین طلاقیں دے دی تھیں۔ عطاؒ ابن یسارؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ ایک پڑی ہے۔

صحابیِ رسول ابنِ عمرو بن العاصؓ نے سنا تو اسے رد کردیا اور فرمایا کہ اے عطاؒ **تم تو قصّہ گو ہو** (یعنی افسانہ طراز ہو) مفتی نہیں ہو۔ غیر مدخولہ کے حق میں **ایک طلاق، طلاقِ بائنہ ہے** اور تین طلاقیں مغلظ۔ تین کے بعد بغیر حلالہ کے گنجائش نہیں۔ (سنن سعید بن منصور)

ہمارے مقالہ نگار دوست بتلائیں ابنِ عمروؓ نے یہ کیا کہدیا؟ ـــ اگر واقعی دورِ رسالتؐ میں تین ایک وقت میں پڑا ہی نہیں کرتی تھیں تو عطاؒ افسانہ طراز کہاں ہوئے۔ انھوں نے تو ٹھیک فتوۂ رسولؐ اور فتوۂ صدیقیؓ کے مطابق فیصلہ دیا پھر کیا صاف ثابت نہیں ہو رہا ہے کہ دورِ رسالتؐ و دورِ صدیقیؓ میں ایسا نہیں تھا۔ طاؤسؒ والی روایت یا تو وہم و خطا ہے یا پھر اس کا تعلّق بہت ہی مخصوص صورتوں سے ہے نہ کہ عام طور پر دی جانے والی تین طلاقوں سے

اسی طرح حضرت ابن زبیرؓ سے جب پوچھا گیا کہ باکرہ تین طلاقوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ بھائی مجھے تو اس بارے میں کوئی بات معلوم نہیں (لم یبلغنا فیہ قول) فرمایا جائے کہ اگر ہمارے دوستوں کا مفروضہ درست ہے تو پھر ابن زبیرؓ نے یہ جواب کیوں دیا۔ وہ تو صاف کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقِ اکبرؓ کے زمانوں میں ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہوتی ہی نہیں تھیں، لہٰذا تم کیوں تشویش میں پڑے ہو۔ طلاق ایک ہی واقع ہوئی، جاکر دوبارہ نکاح کرلو۔

کہاں تک طول دیں۔ کیا کسی ہوشمند کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے زمانوں ایک وقت کی تین طلاقیں ایک مانی جاتی ہوں اور محض ابن عباسؓ تو اس سے واقف ہوں اور ابوھریرہؓ اور ابن عمرؓ اور ابن عمروؓ اور ابن مسعودؓ اور انسؓ اور مغیرہؓ اور علیؓ اور عثمانؓ اور عائشہؓ اور عمران بن حصینؓ رضی اللہ عنہم اجمعین سب ناواقف ہوں اور بلا تکلّف تین کے تین ہونے کا فتویٰ دیئے چلے جائیں اور ایسی باتیں کئے چلے جائیں جن سے صاف ظاہر ہو کہ ان کے فرشتوں کو بھی دورِ رسالتؐ و دورِ صدیقیؓ کے ایسے معمول کی خبر نہیں۔

ناممکن! ـــ ایسا گمان کرنا محالات سے رشتہ جوڑنا ہے۔ ابنِ قیمؒ و ابنِ تیمیہؒ رحمہما اللہ کی معاملہ فہمی اور ذکاوت پر ان کے غلو فی الرائے نے چھاپہ مارا اور بعد والے کچھ تقلیداً اور کچھ کم فہمی کی بنا پر اس بھول بھُلیّاں میں پھنس گئے۔ حدیث ہے ہی ایسا فن کہ اس میں جہاں کوئی بال برابر بہکا بس پھر بہکتا ہی چلا گیا۔ دلائل ہم نے پیش کر دیئے۔ کسی کے پاس کچھ اور سرمایہ ہو تو لائے اور ہم اسے نقد کی بھٹی میں تپائیں۔

ابنِ قیّمؒ کی منطق

اس موقعہ پر ابن قیّمؒ نے اغاثہ میں جو منطق استعمال کی ہے وہ حیرتناک ہے۔ ذرا سُنئے۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ وہ روایت جس میں ابن عبّاسؓ کا ایک بیان دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کے بارے میں پایا جاتا ہے امام مسلمؒ نے تین سندوں سے روایت کی ہے۔ دو سندوں میں طاؤس ابوالصّہبارؒ سے اور ابوالصہبارؒ ابنِ عبّاسؓ سے روایت کرتے ہیں لیکن ایک سند میں ابوالصّہبارؒ کا ذکر نہیں بلکہ طاؤسؒ براہِ راست ابنِ عباسؓ سے روایت کرتے ہیں قصّہ ایک ہی ہے وہی کہ زمانِ رسالتؐ اور زمانِ صدّیقیؓ میں تین طلاقیں ایک تھیں لیکن دو روایتوں میں تو یہ وضاحت ہے کہ ابنِ عبّاسؓ نے یہ بات ابوالصّہبارؒ کے کسی سوال کے جواب میں فرمائی تھی مگر ایک روایت میں یہ وضاحت نہیں اور یہی وہ روایت ہے جس میں ابوالصّہبارؒ کا نام غائب ہے۔ اب معقول اور منصفانہ رائے وہی تھی جو ہم ظاہر کر چکے یعنی یہاں یا تو امام مسلمؒ سے اجتہادی غلطی ہوئی یا ان سے اوپر والے کسی راوی سے۔ قصّہ جب ایک ہی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طاؤسؒ ایک آدمی سے تو یوں کہیں کہ میں نے براہِ راست ابنِ عباسؓ سے سُنا اور دوسرے یوں کہیں کہ ابوالصّہبارؒ کے واسطے سے سُنا۔ طاؤسؒ نے جس طرح بھی سنا ہو یہ بہرحال طے ہے کہ ابنِ عباسؓ نے گزشتہ زمانے کا معمول ابوالصہبارؒ ہی کے جواب میں بیان کیا تھا اور ابوالصہبارؒ کا سوال کیا تھا یہ تحقیق کئے بغیر صحیح طور پر ابنِ عبّاسؓ کی بات کا مصداق و مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ دوسری روایات نے منکشف کر دیا ہے کہ ابوالصہبارؒ کا سوال غیر مدخولہ عورت کی طلاق سے متعلق تھا اور ابنِ عبّاسؓ کا جواب بھی قدرتاً اسی سے منسلک۔

لیکن ابنِ قیّمؒ عجیب و غریب بات کہتے ہیں کہ واقعہ ایک نہیں بلکہ دو ہوں گے۔ ایک واقعہ میں تو ابنِ عباسؓ نے ابوالصہبارؒ کے جواب میں وہ بات کہی ہوگی اور اس کا تعلّق غیر مدخولہ ہی سے ہوگا مگر دوسرے واقعے میں ابوالصہبارؒ کا ذکر نہیں لہٰذا اس وقت ابن عباسؓ نے جو بات کہی وہ ہر طرح کی طلاقوں سے متعلق ہوگی نہ کہ صرف غیر مدخولہ کی طلاق سے متعلّق۔ اسکی دلیل ان کے نزدیک وہی مسلم کی روایت ہے جس میں ابوالصّہبارؒ کا ذکر حذف ہو گیا ہے۔

اہلِ علم تدبّر فرمائیں۔ کیا مجمل اور مفصّل یا مبہم اور مفسّر روایات کے درمیان اس طرح کی منطق

علم الحدیث سے مطابقت رکھتی ہے؟ یہ تو ایک ناواقفِ فن کی موشگافی ہوئی نہ کہ صاحبِ فن کی توجیہ و تاویل، پھر اور ایک لطیفہ دیکھیے۔ اس تنہا روایت کو جس میں ابوالصہبارؒ کا نام حذف ہے قوی سے قوی تر ثابت کرنے کے لئے ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو تو ابنِ عباسؓ نے ہی نہیں تین آدمیوں نے نقل کیا ہے۔ کون تین آدمی؟ — طاؤسؒ۔ ابوالصّہبارؒ — اور ابوالجوزارؒ۔ پھر مزید زور باندھنے کے لئے یہ بھی فرمایا گیا کہ ابوالجوزار کی روایت حاکمؒ نے مستدرک میں بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

یہ لطیفہ کس لحاظ سے ہے اسے اہلِ علم سمجھ گئے ہوں گے۔ ایک تو یوں کہ شیعی طرزِ فکر کے دلدادہ حاکم کی المستدرک کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اسمیں بے شمار روایات انتہائی ضعیف حتیٰ کہ موضوع تک ہیں اور حاکم روایات پر "صحیح" کا عنوان لگانے میں بے حد فراخ دل اور سیر چشم واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبیؒ نے جتنی کچھ اس کی نشاندہی کی ہے وہ اساتذہ کے علم میں ہے۔ ایسے شخص کی تصحیح کو بطورِ حجّت پیش کرنا صاف بتا رہا ہے کہ ابنِ قیمؒ وکالت کے موڈ میں آئے ہوئے ہیں۔ دوسرے یوں کہ ابوالجوزار کوئی بھی تیسرا آدمی نہیں بلکہ ابوالصّہبارؒ ہی کو ایک راوی عبداللہ بن المؤمل نے جن کا حافظ نہایت خراب تھا بجائے ابوالصّہبار کے ابوالجوزار کہدیا۔ یہ بات خود ابنِ قیّمؒ کے علم میں ہے۔ لیکن شاباش کہ ناقلین کی گنتی میں اضافہ کرنے کے لئے انھوں نے یہ نام بھی لے ہی دیا اور اس طرح ابنِ عبّاسؓ سے نقل کرنیوالے دُو سے تین بن گئے۔ ابن قیمؒ کے مقلدین ارشاد فرمائیں اس طرزِ عمل کا کیا نام ہے؟ کیا یہ طرزِ عمل صاف طور پر اس ذہنی کیفیت کا غماز نہیں ہے کہ جس روایت کو ہم اپنے مفید مطلب سمجھ رہے ہیں اسے قوی تر ثابت کرنے کے لئے ایسے شوشے بھی چھوڑیں جن کے متعلق خود ہم ایمانداری سے جانتے ہیں کہ وہ ہوائی ہیں!

حاصل یہ کہ ابنِ عباسؓ سے نقل کرنے والوں میں صرف دو ہی نام لئے جا سکتے ہیں۔ طاؤسؒ اور ابوالصہبارؒ۔ اب ابوالصہبارؒ کا جہاں تک تعلق ہے معلوم ہی ہو چکا کہ اُنے غیر مدخولہ کی طلاق کے بارے میں سوال کیا تھا نہ کہ ہر طرح کی طلاق کے بارے میں۔ لہٰذا اسکی نقل کا حوالہ بھی ابنِ قیمؒ کے لئے شمّہ برابر مفید نہیں بلکہ مضر ہے۔ رہے طاؤسؒ تو انھوں نے ابنِ عبّاسؓ سے اور روایتیں چاہے کتنی ہی نقل کی ہوں لیکن یہ زیرِ بحث روایت بالکل نقل نہیں کی۔ محدّثین اور اساتذہ میں یہ اصول جانا پہچانا ہے کہ اَلثِقَۃُ قَدْ یَخْطِیْ وَیُھِمْ

دربڑے سے بڑا قابلِ اعتماد آدمی بھی خطا و نسیان سے بالا نہیں۔ کبھی نہ کبھی وہ وہم وخطا کا شکار ہو ہی جاتا ہے) امام مسلمؒ کو یہاں غلط فہمی ہوئی یا کسی اور راوی سے چوک ہوئی کہ اس نے طاؤسؒ کی روایت کو براہِ راست ابنِ عباسؓ سے جوڑ دیا حالانکہ دوسرے طرق کہہ رہے ہیں کہ یہ قصہ طاؤسؒ نے براہ راست نہیں بلکہ ابوالصہباءؒ کے واسطے سے سُنا تھا۔

صحیح محدثانہ تاویل روایات کی یوں ہے کہ طاؤسؒ سے متعدد افراد اس واقعے کی روایت کرتے ہیں۔ ان میں ایک ان کا بیٹا بھی ہے اور دوسرے صاحب ابراہیم بن میسرہؒ ہیں۔ ان میں سے دو بزرگوں نے روایت لی۔ ایک معمر دوسرے ابنِ جریجؒ نے۔

معمرؒ نے بے شک ابوالصہباءؒ کا ذکر نہیں کیا بلکہ یا تو قیاساً یہ تصور کر لیا کہ طاؤسؒ چونکہ ابنِ عباسؓ کے شاگرد ہیں اس لئے براہِ راست انھوں نے ابن عباسؓ سے سنا ہوگا یا سہواً ابوالصہباءؒ کا نام رہ گیا۔ یا کوئی ایسا موقعہ ہوگا جہاں اختصار کو مناسب خیال کیا ہوگا — اور ابوالصہباءؒ کے سوال کا ذکر کئے بغیر ابنِ عباسؓ کی بات نقل کر دی ہوگی۔ یہ سب صورتیں بداہتہً ممکن ہیں اور روزمرہ ایسی شکلیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ بہتیری دوسری حدیثوں میں ایسی شکلوں کا وقوع حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے۔

ابن جریجؒ جب اسے طاؤسؒ کے بیٹے سے روایت کرتے ہیں تو وہ مختصراً ابوالصہباءؒ کے سوال کا بھی ذکر کر دیتے ہیں اسی طرح ابراہیم بن میسرہؒ بھی طاؤسؒ کے اس بیٹے ہی سے نقل کرتے ہوئے ابوالصہباءؒ کے سوال کا ذکر کرتے ہیں (ملاحظہ ہو مسلم بابُ طلاقِ الثلاث کی دوسری اور تیسری حدیث) اس سے برملا ثابت ہوتا ہے کہ واقعات مختلف نہیں ہیں ایک ہی واقعے کی نقل میں طاؤسؒ کے بیٹے سے معمرؒ نے جو اجمال اختیار کیا تھا اس کی قدرے تفصیل ابن جریجؒ اور ابن میسرہؒ نے پیش کر دی۔ البتہ ذرا سا اجمال ان دونوں کے بھی بیان میں یہ رہا کہ ابوالصہباءؒ کے سوال میں غیر مدخولہ کی جو قید پائی جاتی تھی وہ ذکر سے رہ گئی۔ اس کی ایوبؒ اور بعض دیگر راویوں نے پوری کر دی جن کی روایت ابوداؤد میں موجود ہے۔ امام ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں :-

حَمَّادِبْنِ زَيْد عَنْ اَيُّوب عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ عَنْ طَاؤس یعنی یہ بات کہ ابوالصہباء کا سوال غیر مدخولہ کی طلاق کے بارے میں تھا اور ابن عباسؓ نے دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کا جو معمول بتایا وہ اسی سے مربوط تھا۔ طاؤسؒ سے متعدد آدمیوں نے اور ان میں ایوبؒ اور ان سے حماد بن زیدؒ نے نقل کی۔

اس طرح گویا ترتیب یوں بنی کہ معمرؒ کی روایت کے ابن جریجؒ اور ابن میسرہؒ کی روایتیں مفسر بنیں اور ان دونوں کی روایتوں کے لئے بعض اور راویوں کی روایات نے تفسیر و تفصیل کا کام انجام دیا۔ اس طرح پورا واقعہ یوں کھل کر سامنے آیا کہ ابن عباسؓ نے دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ اور دورِ عمرؓ کے ابتدائی دو تین سالوں کا جو معمول بتایا تھا اس کا تعلق غیر مدخولہ کی طلاق سے تھا۔

پھر غیر مدخولہ کی طلاق میں دو شکلوں کی وضاحت ہم کر ہی آئے، اور بتا آئے کہ — ابنِ عباسؓ بھی غیر مدخولہ کی تین طلاقوں کو تین ہی مانتے ہیں۔ اگر عدد کی صراحت سے بیک فقرہ دی جائیں۔ ہاں "تجھ پر طلاق" کا فقرہ اگر تین بار دہرایا جائے تو چاہے ایک ہی منھ اور سانس میں دہرایا جائے اسے وہ ایک طلاق کہتے ہیں۔ جیسا کہ دیگر صحابہؓ سے بھی منقول ہے۔ تو بات یہ بن گئی کہ ابنِ عباسؓ کے جواب کا تعلق یقینی طور پر غیر مدخولہ کی اس طلاق سے تھا جو تین بار اَنْتِ طَالِقٌ کہہ کر دی جائے عدد کے ساتھ نہ دی جائے۔

کہنا ہی پڑے گا

ہم کہنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن احقاقِ حق کے لئے کہنا ہی پڑے گا کہ طاؤسؒ کی یہ روایت جس میں دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کا معمول بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقوں کے تین نافذ کرنے کی ابتدا کی دراصل ہے ہی سرے سے غلط اور بے بنیاد۔ ہم نے اگرچہ معقول طور پر اس کی توجیہ پیش کر دی ہے جس کے بعد اس سے جمہور کے اجماعی مسلک پر حرف نہیں آتا لیکن یہ ہم نے صرف تنزّلاً کیا اور بہت سے اہلِ علم اسی طرح اس کی توجیہ کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اب ہم جو یہ کہہ رہے ہیں کہ فی الاصل یہ روایت ہے ہی وہم وخطا تو اس کہنے میں ہم بعض دیگر اکابر اساتذہ کی پیروی کر رہے ہیں جن میں سے کچھ نام یہ ہیں :-

(۱) حنابلہ کے بلند پایہ عالم ابن رجب حنبلیؒ۔ ذیل تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۱۸۰ میں ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے ــــــ الامام الحافظ الحجۃ والفقیہ العمدہ احد العلماء الزہاد والائمۃ العُبّاد مفید المحدثین واعظ المسلمین۔ آٹھویں صدی ہجری کی معروف ترین شخصیت ہیں۔

(۲) امام احمد بن حنبلؒ۔ انھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی اس حدیث کو کم سے کم شاذ یا منکر قرار دیتے ہوئے مطلق لائقِ استناد نہیں سمجھتے۔

(۳) امام شافعیؒ۔ یہ بھی تعارف سے بے نیاز ہیں۔ ابن قدامہؒ نے المغنی میں امام شافعیؒ کی بھی رائے اس حدیث کے بارے میں یہی نقل کی ہے کہ یہ معلول ہے یعنی علت آلودہ لہٰذا قابلِ احتجاج نہیں۔

(۴) جوزجانیؒ۔ مشہور صاحب الجرح۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے بہت تحقیق کی لیکن اس حدیث کی قطعاً کوئی اصل نہیں ملی۔ یہ بنیاداً ہی وہم وخطا ہے۔

(۵) ابوعمرو حافظ ابن عبدالبرؒ۔ شہرۂ آفاق استاذِ فن اور اہلِ علم کے معتمد۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اس حدیث کی معنوی تاویل ضروری نہیں۔ یہ شاذ ہے اسے ایک ہی طرف رکھو۔

(۶) حسین بن علی الکرابیسیؒ "ادب القضاء" میں بیان کرتے ہیں کہ ہمیں خبر دی علی بن عبداللہؒ (وہو ابن المدینی) نے بواسطہ عبدالرزاقؒ، انھوں نے معمرؒ سے، معمر نے طاؤسؒ کے بیٹے سے اور اس بیٹے نے اپنے باپ طاؤسؒ سے یہ بات نقل کی مَن حَدَّثَكَ عَن طاؤسٍ انّه کان یروی طلاق الثلث واحدۃ فکذبه (تم سے جس شخص نے میرا نام لے کر یہ کہا کہ طاؤسؒ تین طلاقوں کے ایک ہونے کی روایت بیان کرتا تھا اسے سچا مت سمجھو)

(اعلاء السنن جلد ۱۱ ص ۵۲۴)

یہ تو ہوئیں اس روایت کے قابلِ رد ہونے کی شخصی شہادتیں۔ اگر غیر جانبداری کے ساتھ عقل و درایت اور اصولِ فن کا استعمال کیا جائے تو مندرجہ ذیل وجوہ بھی اس کے وہم و غلط ہونے پر شاہد ہیں۔

(۱) اس میں ابن عباسؓ سے یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صدیقیؓ اور خلافتِ عمرؓ کے ابتدائی چند سالوں میں تین طلاقیں ایک ہوا کرتی تھیں یہ قول ہی سرے سے باطل ہے۔ جو طلاقیں طریقِ سنت کے مطابق تین الگ الگ طہروں میں دی جائیں وہ تولازماً بلا اختلاف تین ہی ہوتی ہیں حالاں کہ اس قول میں ان کا استثناء نہیں۔ اس قول کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن و سنّت جس صورت میں تین طلاق کے واقع ہونے پر ناطق

ہیں اس صورت میں بھی دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ میں ایک ہی طلاق پڑا کرتی تھی، لہٰذا ابن عباسؓ کی طرف ایسے لغو قول کی نسبت قابلِ قبول نہیں۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ سنت کے مطابق دی گئیں تین طلاقیں مستثنیٰ ہیں۔ یعنی ابنِ عباسؓ جن تین طلاقوں کے ایک ہونے کا ذکر کر رہے ہیں وہ، وہ نہیں ہیں جو تین مختلف طہروں میں دی گئیں۔ ان کا وقوع تو بہرحال مسلّم ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ استثناء آپ نے کہاں سے نکالا۔ ابنِ عباسؓ نے تو بلا استثناء "تین طلاق" کہا۔ اگر قیاس کے ذریعے آپ یہ استثناء نکالتے ہیں تو ہم کیوں نہ قیاس کے ذریعہ ان تین طلاقوں کو بھی مستثنیٰ مانیں جن میں بحث ہو رہی ہے اور یہ کہیں کہ ابنِ عباسؓ باکرہ غیر مدخولہ کی تین طلاقوں کا ذکر کر رہے ہیں جن سے ہمیں بحث ہی نہیں۔ کون سا قانونِ انصاف ہے جو فریقِ ثانی کو تو قیاس کے ذریعہ استثنیٰ کی اجازت دے اور ہمیں نہ دے۔ استثنیٰ کرو تو ہم سے مشورہ لے کر کرو ورنہ قول کو لغو مانو۔

(۲) مسلمؒ کا اس حدیث کو اپنی صحیح میں لانا خطاء ہے جس کے دو قرینے یہیں مسلمؒ میں موجود ہیں ایک یہ کہ ایک طریق میں انھوں نے ابوالصہباءؒ کا نام حذف کر دیا ہے حالاں کہ دو طرق میں نام موجود ہے۔ واقعہ تینوں جگہ ایک ہے۔ لہٰذا انقطاع و اضطراب سند میں بھی پایا گیا اور متون میں بھی۔ دوسرے یہ کہ ایک طریقہ میں ابوالصہباءؒ حضرت ابنِ عباسؓ سے کہتا ہے هَاتِ مِنْ هُنَاتِكَ لفظی ترجمہ تو اس کا بے شک یہ ہے کہ ذرا اپنے عجائب و غرائب میں سے فلاں عجوبہ بیان کیجئے لیکن عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ایک محاورہ ہے جس کا استعمال کوئی بہت ہی بے تکلف دوست طنزاً یا تمسخراً کر سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ ایک عظیم المرتبت بردبار باوقار صحابی تھے۔ ان سے ایسا بے تکلفانہ تخاطب تو اکثر جلیل القدر صحابہؓ بھی شاید نہ کر سکتے۔ یہاں ان کے گھرانے کا ایک غلام ابوالصہباءؒ کا یہ کارنامہ انجام دے رہا ہے اور ابنِ عباسؓ اس کے چانٹا بھی نہیں مارتے۔ یہ صریحاً خلافِ قیاس ہے۔ ویسے بھی یہ ابوالصہباء بعض اربابِ فن کے نزدیک راویِ ضعیف ہے۔

پھر ایک اور بات۔ اگر فرض ہی کرلیں کہ ابوالصہباءؒ نے ایسا کہدیا ہو تو عربی محاورے کے مطابق اس سے خود ثابت ہوگیا کہ تین کے ایک ہونے کی بات کو خود ابوالصہباء مضحکہ خیز اور مردود تصوّر کرتا ہے۔ کیا یہ روزمرّہ کی بات نہیں کہ کسی صاحب کے کسی خیال کو غلط قرار دینے کے لئے ہم ادباً اور اخلاقاً یوں کہتے ہیں کہ "حیرت ہے وہ ایسا فرمارہے ہیں"

ٹھیک یہی سیاق اس تحیّر کا ہے جو اس عربی محاورے میں پایا جاتا ہے۔ اس محاورے کو زیادہ قریب الفہم بنانے کے لئے " دیومالا " کے لفظ کا تصوّر کیجئے۔ جس طرح کی افسانوی باتوں کو ہم لوگ " دیومالا " سے تعبیر کرتے ہیں ایسی ہی باتوں کے سلسلہ میں یہ عربی محاورہ بولا جاتا ہے۔

(۳) ابن عباسؓ کے فتاویٰ اس روایت کے خلاف تواتر سے ثابت ہیں۔ یہ نکتہ بھی تو ہمارے بزرگوں نے کردی کہ راوی کا فتویٰ اگر اس کی روایت کے خلاف ہو تو اعتبار فتوے کا نہیں ہوگا روایت کا ہوگا۔ لیکن یہ وہ بھول گئے کہ یہ قاعدہ متفق علیہ ہرگز نہیں۔ چند نام تو ہم ہی پیش کئے دیتے ہیں جن کے نزدیک یہ قاعدہ قابلِ قبول نہیں۔

امام احمدؒ۔ ابن المدینیؒ۔ یحییٰ بن سعید القطانؒ۔ یحییٰ بن معینؒ۔ اس کی نشاندہی حافظ ابن رجبؒ نے امام ترمذیؒ کی کتاب العلل کی شرح میں فرمائی ہے۔

ویسے بھی معاملہ عام راوی کا نہیں ابنِ عباسؓ جیسے کثیر العلم صحابی کا ہے۔ پھر جو فتویٰ وہ بار بار دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق فتوے دوسرے دسیوں صحابیؓ دے رہے ہیں لیکن روایت کیمطابق کسی ایک بھی صحابیؓ کا فتویٰ منقول نہیں پھر یہ زبردستی کے سوا کیا ہے کہ آپ طاؤسؒ والی روایت کو تو وحی آسمانی قرار دیں اور سارے صحابیوںؓ کو حدیث کے خلاف فتویٰ دینے کے جرم کا مرتکب ٹھیرائیں۔

مزید یہ کہ فتوے کے مقابلے میں راوی کی روایت کے اعتبار کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ روایت بھی ثابت ہو۔ ہم نے دلائل سے واضح کردیا کہ یہ روایت وہم و خطا ہے یا کم سے کم شدید طور پر مضطرب تو ہے ہی۔ اس کے برعکس ابنِ عبّاسؓ کے فتاویٰ صحیح سندوں سے صریح الفاظ کے ساتھ ثابت ہیں اور فریقِ ثانی بھی اس کا معترف ہے لہٰذا ایسا تو کوئی محدّث اور استاذِ فن نہیں جو اس صورت میں بھی روایت کو فتوے پر ترجیح دیتا ہو (۴) اس روایت کو صحیح ماننے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے کھلم کھلا شریعت سے انحراف کیا۔ قانونِ معروف کو بدلا نعوذ باللہ من ذالک۔ ایک لاکھ مرتبہ نعوذ باللہ!

(۵) اور یہ بھی لازماً مطلب ہے کہ جملہ صحابہؓ اس قدر دین و شریعت سے لاپروا ہوگئے تھے کہ حضرت عمرؓ کو دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کے مسلّمہ قانون اور معمول کے خلاف اعلان کرتے دیکھ رہے ہیں اور نہیں کہتے کہ اے امیرالمومنین یہ کیا جسارت ہے! —— حالانکہ یہ لوگ وہ تھے جن میں کہ ایک معمولی فرد نے بھی برسرِعام امیرالمؤمنین سے کہدیا تھا کہ

اگر تم ٹیڑھے چلے تو تلوار سے تمھیں ٹھیک کردیا جائے گا۔

اور قرآن کی آیت تو تازہ ہی تھی۔ اللہ نے فرمایا تھا کہ اگر تمھارے مابین اختلاف ہو تو رسولؐ کو قاضی بناؤ اور جو فیصلہ وہ کریں اسے نہ صرف مانو بلکہ تمھارے دل و دماغ میں بھی مطلق ناگواری کا گذر نہ ہو۔ کیا تماشہ ہے کہ ہمارے دوستوں کو دعوے کیمطابق اس وقت کسی نے بھی دورِ رسالتؐ کے معمول کو قاضی نہیں بنایا بلکہ حضرت عمرؓ کی اتنی بڑی جسارت بہ اطمینان برداشت کرگئے۔ العیاذ باللہ۔

(۶) **یہ کوئی فضائل و نوافل کا مسئلہ تو ہے نہیں حلال وحرام کے دُوررس قانون کا مسئلہ** ہے۔ فن کے اعتبار سے اس روایت میں کچھ بھی جان ہوتی تو امام بخاریؒ اسے بالکل ہی ناقابلِ التفات تصوّر نہیں کرسکتے تھے۔ آخر کیا بات ہے کہ وہ اشارۃً بھی اس کی طرف متوجّہ نہیں ہوتے۔ بے شک امام بخاریؒ کا عدمِ التفات کسی بھی روایت کے **غلط ہونیکا** قطعی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ لیکن معناً جس اہمیت کی حامل یہ روایت ہے **اسے اتنے بڑے** امامِ فن کا نظرانداز کرجانا قرینہ بہرحال ہے اس بات کا کہ فنی اعتبار سے یہ روایت مستحقِ اعتنا رہے ہی نہیں۔

(۷) اصولاً یہ حدیث "غریب" ہے ابن عباسؓ سے فردِ واحد کے سوا اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔ ابنِ قیّمؒ کی صریح غلطی ہے کہ وہ خواہ مخواہ تین کی گنتی گنوا دیتے ہیں۔ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ ان تین میں **ابوالجوزار تو محض مفروضہ ہے۔ وہ سوائے ابوصہبارؒ کے کوئی شخص نہیں** رہا **ابوالصہبارؒ تو اس کی روایت میں "غیر مدخولہ" کی قید موجود ہے یعنی اس کی روایت** کی رو سے **ابنِ عباسؓ کا قول زیرِ بحث طلاقوں سے متعلق نہیں بلکہ باکرہ کی طلاق سے متعلق** ہے۔ لہٰذا لے دے کے صرف وہ ایک روایت رہ جاتی ہے جسے امام مسلمؒ نے ابوصہبا کے واسطے کے بغیر بیان کیا ہے اور اس میں طاؤسؒ براہِ راست ابنِ عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ خصوصاً جب ابنِ قیّمؒ یہ شوشہ چھوڑتے ہیں کہ واقعے دو ہوں گے ایک نہیں پھر تو طاؤسؒ عن ابنِ عباسؓ والی روایت کا "غریب" ہونا اور بھی مسلّم ہوجاتا ہے۔

بے شک حدیثِ غریب ہرحال میں قابلِ رد نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی معلوم ہیکہ چوٹی کے اساتذۂ فن میں کافی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو غرائب (غریب حدیثوں) سے بچنے ہی میں خیر سمجھتے ہیں۔ مثلاً امام احمدؒ کا ارشاد ہے کہ غریب حدیثوں کو مت لکھو یہ تو مناکیر ہیں

اور عام طور پر ضعیف راویوں سے مروی ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں شر العلم الغریب الخ (غریب حدیثیں ایک علمی فتنہ ہیں اور علمی خیر و برکت تو ان روایتوں میں ہے۔ جنھیں مختلف لوگ روایت کرتے ہوں۔ جو معروف ہوں) عبدالرزاقؒ کا ارشاد ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ غریب حدیثوں میں خیر ہے لیکن پھر اس نیجے پر پہنچے کہ ان میں تو شر ہے۔ ابن المبارکؒ فرماتے ہیں کہ علم تو وہ ہے جو یہاں اور وہاں سب جگہ جانا اور پہچانا ہو۔ یعنی متعدد لوگ اور حلقے اس سے باخبر ہوں (المدخل للبیہقی) بیہقیؒ نے امام زہریؒ اور علی ابن حسینؓ کا ایک مکالمہ بھی روایت کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علم تو وہ ہے جسے لوگ عموماً پہچانتے ہوں جو زبانوں پر جاری ہو۔ جو شاذ نہ ہو۔ ابنِ عدیؒ، قاضی ابویوسفؒ کا ایک دلچسپ قول نقل کرتے ہیں کہ جس نے قرآن وحدیث کو چھوڑ کر علمِ کلام سے دین حاصل کرنے کی کوشش کی وہ زندقہ میں پھنسا، جس نے غریب حدیثوں کی طلب میں سر مارا غلط کام میں وقت برباد کیا، اور جس نے کیمیا کے ذریعہ دولت کمانی چاہی مفلس ہو گیا۔ ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ غریب حدیثیں بیان کرنا محدثینِ سلف میں قبیح تصور کیا جاتا تھا۔

غریب حدیثوں سے متعلق اسی نہج کے اور بھی بہت اقوال کتابوں میں موجود ہیں ان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غریب حدیثوں سے حجت پکڑنا اہلِ فن کے یہاں عموماً پسندیدہ نہیں۔ لیکن اس حدیثِ طاؤسؒ کی غربت تو اس درجے کی ہے کہ جو لوگ اصولاً حدیث غریب کو قابلِ رد نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کیوں کہ اوّل تو اسکا بڑا عیب یہ ہے کہ ابنِ عباسؓ کے دوسرے ثقہ شاگرد جو کچھ نقل کرتے ہیں یہ اس کی ضد ہے دوسرے یہ کیسے ممکن ہے کہ حلال وحرام سے متعلق ایک اہم ترین معاشرتی قانون کے سلسلہ میں دورِ رسالتؐ اور دورِ صدیقیؓ کا ایک معمول فقط ابنِ عباسؓ کے علم میں آئے اور کوئی بھی دوسرا صحابیؓ اس کا ذکر نہ کرے۔ اشارہ تک نہ کرے۔

خود امام مسلمؒ اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں غریب حدیثوں کے ردّ و قبول کا جو معیار پیش فرماتے ہیں اس کی رو سے بھی یہ روایت انھیں درجِ مسلم نہ کرنی چاہیے تھی مگر آدمی تو خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ جدِّ امجد آدم علیہ السلام ہی بہک گئے تو اب کون ہے جس کا خمیر سہو و خطا کی آمیزش سے پاک ہو۔

٭٭٭

سچ یہ ہے

کہنے دیجیے کہ حقیقت میں اس مسئلہ میں اجماع کے خلاف شوشہ چھوڑنے والے صرف خوارج اور رافضی ہو سکتے ہیں ورنہ شیعہ حضرات جن جعفر بن محمد صادق رحمتہ اللہ علیہما کے تبع اور ارادت مند ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں ہمارے بھی محترم بزرگ ہیں ان کا صریح فتویٰ بیہقیؒ نے سندِ صحیح کے ساتھ اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ مسلمہ بن جعفر الاحمس نے ان سے کہا کہ کچھ لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جہالت کی بنا پر تین اکٹھی طلاقیں دے بیٹھے تو اسے طریقِ سنّت کی طرف لوٹایا جائے گا اور ایک ہی طلاق مانی جائے گی اور اس رائے کو وہ آپ ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں؟ —— امام جعفرؒ نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا معاذ اللہ میری یہ رائے کیوں ہوتی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جس نے جتنی طلاقیں دیں اتنی ہی پڑیں گی۔ تین دیں تو تین پڑیں گی۔ (یہ روایت آلوسیؒ نے بھی روح المعانی میں لی ہے۔)

شیعی فقہ سے ہم ضروری واقفیت نہیں رکھتے لیکن کم سے کم اس مسئلہ میں بہ اطمینان کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں نے بھی اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم کی طرف جمہور کی رائے کے خلاف رائے رکھنے کا قول کیا، غلطی کی۔

شیعہ دوست اپنے یہاں کی معروف کتاب المجموع الفقهی الکبیر کی شرح الرّوضُ النضیر ملاحظہ فرمائیں۔ جلد چہارم کے ص ۱۳۷ پر انھیں ملے گا کہ ایک ہی لفظ کے ساتھ تین طلاقوں کا واقع ہو جانا جمہورِ اہلِ بیت کا مذہب ہے جیسا کہ محمّد بن منصورؒ نے اہلِ بیت اطہار ہی کی سندوں سے اسے امالی میں نقل کیا ہے —— اور الجامع الکافی میں حسن بن یحییٰؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے فرمایا ہم نے یہی بات نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اور علی علیہ السلام سے اور علی بن الحسینؓ سے اور زید بن علیؓ سے اور محمد بن علی الباقرؓ سے اور محمّد عمر بن علیؓ سے اور جعفر بن محمّدؓ سے اور عبداللہ بن الحسنؓ سے اور محمّد بن عبداللہؓ سے اور دیگر خیارِ آلِ بیتِ رسولؐ سے نقل کی ہے۔

پھر فرمایا —— یعنی حسن بن یحییٰؒ نے فرمایا —— تمام آلِ رسولؐ کا اس پر اجماع ہے کہ جس کسی نے ایک کلمہ میں تین طلاقیں بیوی کو دیں اس پر بیوی حرام ہو گئی چاہے

صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور یہی بات بحر میں روایت کی گئی ہے ابنِ عباسؓ اور ابن عمرؓ اور عائشہؓ اور ابو ہریرہؓ اور علی کرم اللہ وجہہ سے اور ناصرؒ اور مؤیدؒ اور یحییٰؒ اور مالکؒ اور بعض امامیہ سے۔

دیکھا آپ نے۔ خود شیعی فقہ سے بھی اجماع کا ثبوت موجود ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں کہ فتنے کی جڑ روافض و خوارج بنے ہیں اور بعد میں شیعوں اور سنیوں کے متعدد مخلصین نے ان سے ہی دھوکا کھایا ہے۔

ابن مغیث اور محمد بن وضاح

کتنے دکھ کی بات ہے کہ ابن حجرؒ نے اگر بعض شیعوں کے علمِ کلام کا تعارف کراتے ہوائے ابن مغیث کی کتاب الوثائق کا حوالہ دے دیا تو نومولود مجتہدین کو ذرا توفیق نہیں ہوتی کہ پتا تو چلائیں یہ کون ذات شریف ہیں اور ان کے علم و فہم کا کیا جغرافیہ ہے۔ اب جو بھی مولانا حامد علی صاحب کے مقالہ میں ابنِ حجرؒ کی یہ عبارت پڑھے گا یہی سمجھے گا کہ متعدد صحابہؓ اور مشائخ تین طلاقوں کے وقوع کو نہیں مانتے تھے۔ ہم بتا آئے ہیں کہ یہ محض افسانہ طرازی ہے۔ کورا جھوٹ ہے۔

ابن مغیث کا پورا نام ہے ابو جعفر احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی۔ پانچویں صدی ہجری کے چھٹے عشرے میں انتقال کیا۔ اساتذہ ان کا تعارف یہ کراتے ہیں کہ نہ تو ان کی سمجھ بوجھ اور عقل کا اعتبار نہ ان کی دیانتِ نقل کا علم۔ ان کی بعض آرار سے پتا چلتا ہے کہ فہم و تفقہ سے کورے تھے۔ انھوں نے کتابُ الوثائق لکھی اور اس میں مختلف صحابہؓ اور مشائخ کی طرف مذکورہ مسلک کا انتساب کرتے ہوئے بجائے سند بیان کرنے کے محمد بن وضاح کا حوالہ دے دیا۔ اب اگر ان صاحب کی طرف انتساب صحیح بھی ہو تو ان کا بھی حال سُن لیجئے کہ کیا تھے اور کون تھے۔

اندلس کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ہم عصر ابو الولید الفرضی متعارف کراتے ہیں کہ یہ شخص اگرچہ کثرت سے روایات بیان کرتا ہے لیکن نہ تو عربی آتی جاتی ہے نہ فقہ سے مناسبت ہے نہ جانے کتنی صحیح احادیث کا انکار کرتا ہے۔ اس کی حیثیت عالم کی ہے ہی نہیں بلکہ عامۃ النّاس میں سے ہے اور اس جیسے آدمی کی گل افشانیوں سے وہی لوگ

دل چسپی لے سکتے ہیں جن کے پاس کرنے کا کوئی اور کام نہ ہو۔

یہ ہیں محمد بن وضاح ــــ کیا کوئی بھی ہوش مند ایک منٹ کے لئے بھی تصوّر کر سکتا ہے کہ ابنِ مغیث اور محمدّ بن وضاح جیسے لوگوں کی بے سند روایتیں منھ لگانے کے قابل ہو سکتی ہیں جب کہ وہ صحیح الاسناد روایات کے خلاف ہوں

سچ کہا امام خطابیؒ نے القول بعدم وقوع الطلاق البدعی قول الخوارج والروافض اور بجا فرمایا ابن عبد البرؒ نے لایخالف فی ذٰلک الا اھل البدع والضلال۔ یعنی طلاق اکٹھی تین دی جائیں یا حالتِ حیض میں دی جائیں یا ایسے طُہر میں جس میں صحبت کی جا چکی ہو یہ سب طلاقِ بدعی ہیں لیکن یہ واقع ہو جاتی ہیں اور یہ قول تو محض خوارج اور روافض کا ہے کہ نہیں واقع ہوتیں اور بدعتیوں اور گمراہوں کے سوا اس مسئلے میں کسی کی مخالفت معلوم نہیں۔

اور حقیقت افروز ہے ابنِ رجبؒ کا یہ ارشاد کہ لاتعلم احداً من الامۃ الخ یعنی بعد تحقیق و تدقیق کے انھوں نے فرمایا:۔

"امت میں ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے ظاہراً یا حکماً یا قضاءً یا علماً یا افتاءً اس مسئلہ کی مخالفت کی ہو۔ مخالفت اگر سنی گئی ہے تو معدود دے چند نا قابلِ لحاظ لوگوں سے سنی گئی ہے اور اسی کا حال یہ ہے کہ ایسے مخالفین پر خود ان کے ہم عصر علمار نے سخت نکیر اور لے دے کی ہے۔"

(بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلث واحدۃ)

ہم نام نہیں لیتے

اجماعِ امّت کے خلاف "اجتہاد" کا علم اٹھانے والے بعض علاّمہ قسم کے بزرگ کہاں سے کہاں تک جا پہنچے ہیں یہ بے حد المناک ہے۔ نام نہیں لیں گے کہ ہم پر چھوٹا منھ بڑی بات کی پھبتی کس دی جائے گی۔ عقل جب بہکتی ہے تو کیسے کیسے گُل کترتی ہے اس کی مثال اور سُن لیجئے:۔

فرمایا گیا ہے:۔ ان لفظۃ طالق ثلاثا فی الانشاء والایقاع محال عقلاً باطلٌ لغۃً فصار لغواً من الکلام لم یعرفھا الصحابہ ولم یمضھا

اَحَدٌ مِّنْهُمْ على الناس وانما الذى امضوه ماكان بالتكرار وكلمة انت طالق ثلاثا محال وانما هى تلاعب بالالفاظ بل هى تلاعب بالعقول والافهام۔"

کیا طنطنہ ہے۔ کیا تیور ہیں۔ کہنے والا آپے سے باہر ہوگیا ہے۔ اسے ادراک ہی نہیں کہ کیا اس کے قلم نے اگل دیا ہے۔

قارئین سنیں ——— فرمایا گیا ہے کہ جب اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا (توتین طلاقیں والی ہے) کہا جائے تو اس سے تین طلاقیں پڑ ہی نہیں سکتیں ان کا پڑنا عقلاً محال اور لغتہً باطل ہے۔ لہٰذا یہ ایسا کلام ہوا کہ صحابہؓ اس سے واقف ہی نہ تھے، نہ انھوں نے اس فقرے کے نتیجے میں کسی پر تین طلاق نافذ کی ہوں گی۔ جن صحابہؓ نے نافذ کی ہوں انھوں نے بس اُس صورت میں نافذ کی ہوگی کہ دینے والے نے تین بار کلمۂ طلاق دہرایا ہوگا۔ صرف اتنا کہدینا کہ "توتین طلاق والی ہے" از قبیلِ محالات ہے ——— نیز لفظوں کے ساتھ بلکہ عقل وفہم کے ساتھ کھیل کرنا ہے۔

اب نوپید امجتہدین تو اس منطقی شاعری پر وجد کرسکتے ہیں لیکن سنجیدہ تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ منطق غبارے کے مانند ہے جس میں ہوا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لسانی رُخ سے یہ منطق ایسی ہی پوچ ہے جیسے زید اپنے بیٹے سے یوں کہے کہ "تم میرے لئے بازار سے کپڑا لاؤ گے" اور آپ یہ فرمانے لگیں کہ قواعد کے اعتبار سے چونکہ صیغۂ امر استعمال نہیں ہوا بلکہ پیش گوئی کی گئی لہٰذا اس فقرے سے زید کے بیٹے پر تعمیلِ حکم لازم آجانا عقلاً محال اور لغتہً لغو ہے۔

فرمائیے کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا واقعی ایسی گُل افشانی فرماسکیں گے؟

خیر حقائق کی طرف آیئے۔ محاورے کے اعتبار سے اَنْتِ طَالِقٌ کے معنیٰ یہ نہیں کہ "تو طلاق والی ہے" بلکہ یہ ہیں کہ "تجھ پر طلاق"۔ کتنی ہی احادیث میں آیا ہے کہ فلاں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں اور فلاں نے ہزار۔ ان سب مواقع پر حضورؐ اور صحابہؓ کے یہ صریح فتاویٰ منقول ہیں کہ تین تو پڑ گئیں اور باقی لغو ہوئیں اب یہ تو کھلی بات ہے کہ طلاق دینے والے الگ الگ گن کر سو یا ہزار طلاقیں نہ دیتے ہوں گے بلکہ انکا فقرہ یوں ہوتا ہوگا کہ اَنْتِ طَالِقٌ مِائَةً یا الفاً (تجھ پر سو طلاقیں یا ہزار طلاقیں) اسی طرح یہ واقعہ بھی مذکور ہے

کہ فلاں نے اپنی بیوی کو ستاروں کی برابر طلاقیں دے دیں۔ ظاہر ہے اس نے عَدَدُ النُّجُوم کا بولا ہوگا۔ ستارے گن گن کر تو طلاقیں نہ دی ہوں گی۔ ایسے تمام مواقع پر تین کا فتویٰ صادر کرنا نصِ قطعی ہے اس بات کے لئے کہ حضورؐ اور صحابہؓ لفظِ واحد میں تین طلاقیں واقع ہوجانے کو نہ محال سمجھتے تھے نہ لغو۔ لفظ "ہزار" سے بھی تین طلاقوں کا وقوع یہ بتاتا ہے کہ لفظ تو بڑی چیز ہے لفظ کا بہت ہی قلیل حصہ اگر تین کی طرف مشیر ہورہا ہو تو تینوں پڑجائیں گی۔ علاوہ ازیں آگے فتاوائے صحابہؓ کے ذیل میں آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو یہی لکھ کر بھیجا تھا کہ جو شخص اَنْتِ طَالِقٌ ثَلٰثًا کہتا ہے اس سے تین طلاقیں پڑجاتی ہیں اور نواسۂ رسولؐ حسنؓ ابنِ علیؓ نے اپنی زوجہ عائشہ بنتُ الفضلؓ کو ٹھیک ان ہی الفاظ میں تین طلاقیں دی تھیں۔

امام نخعیؒ، امام شافعیؒ، امام محمدؒ، امام جعفرؒ صادق، امام حسن بصریؒ، امام مالکؒ، امام ابن سیرینؒ، امام محمد بن الحسنؒ شیبانی، امام ابوحنیفہؒ، امام شعبیؒ اور کس کس کے نام لئے جائیں جن کے بارے میں بلاریب ثابت ہے کہ وہ اس فقرے سے تین طلاقوں کے وقوع کو مسلّم مانتے تھے۔ حد ہے کہ پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مذہب تو مؤطا میں یہ نقل ہوا ہے کہ صریحاً تین کہنے ہی سے نہیں یوں کہنے سے بھی تین طلاقیں پڑجائیں گی کہ اَنْتِ طَالِقٌ البَتَّةَ (تجھ پر طلاقِ بتّہ)

اب کیا یہ مان لیا جائے کہ نہ ان تمام بزرگوں نے عربی لغت اور فہم وخرد کے تقاضوں کو سمجھا نہ عمرؓ اور ابوہریرہؓ اور علیؓ اور حسن بن علیؓ اور ابوموسیٰؓ وغیرہ محال اور غیر محال کا فرق سمجھتے تھے۔ کسی نے سمجھا تو سات آٹھ سو برس بعد سمجھا۔ زبان کوئی کسی کی نہیں پکڑ سکتا۔ جتنے دعوے چاہو اُچھالے جاؤ۔ مگر سوال ہے دلیل کا۔ سند کا۔ معقولیت کا۔

ہم چیلنج کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نحو وصَرف کے ائمہ اور عربی زبان ولغت کے ماہرین میں سے کسی ایک نے بھی ایسا کوئی قاعدہ بیان نہیں کیا جس کی رُو سے لفظِ واحد کے ذریعے تین طلاقوں کا وقوع نہ ہوسکتا ہو۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ حضرت عمرؓ اور حضرتِ علیؓ وحسنؓ تو عرب نژاد تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اور مذکورہ بالا بزرگوں میں امام محمد بن الحسنؒ تو وہ شخصیت ہیں جنھیں ان کے اپنے اور بیگانے سب زبانِ عربی میں اتھارٹی (سند) مانتے آئے ہیں اور خیر سے جو بزرگ منطق جھاڑ رہے ہیں وہ عجمی ہیں

عربی نہیں۔!

ابنِ تیمیہؒ پر تعجب ہے

امام ابن تیمیہؒ اپنے دادے ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلامؒ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ تین طلاقوں کے ایک ہونے کا بھی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ہم پیچھے ابوالبرکات ہی کی منتقی الاخبار سے نقل کر آئے کہ وہ تو تین واقع ہو جانے پر اجماع کے قائل ہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہوں۔ اب ان کی دوسری کتاب المحررؔ میں ان کا فتویٰ بھی دیکھئے:۔

لوطلقها اثنتين اوثلاثا بكلمة اوكلمات فى طهر فمافوق من غير مراجعة وقع وكان للسنة۔

(اگر ایک ہی فقرے میں دو یا تین طلاقیں دیں تو چاہے ایک طہر میں دی ہوں یا اس سے زیادہ میں بغیر لوٹائے تو وہ واقع ہو جائیں گی بطورِ سُنّت)

خدا جانے ابنِ تیمیہؒ المحررؔ سے بے خبر کیسے رہ گئے۔ یا پھر خبر دار تو ہوں گے مگر انھیں غلط اطلاع ملی ہوگی کہ میرے دادے کبھی کبھی چوری چھپے اس کے خلاف بھی فتویٰ دید یا کرتے تھے۔ اگر اطلاع صحیح ہو تو ظاہر ہے کہ یہ فعل دوسروں کے لئے حجت تو بننے سے رہا ہاں خود فاعل کی شہرت داغدار ہوتی ہے۔

مدیر "زندگی" کے مقالے

"زندگی" میں مدیرِ زندگی مولانا عروج احمد قادری کے دو مقالے شاملِ اشاعت ہیں ایک وہ جو سیمنار میں پڑھا گیا اور ایک وہ جو انھوں نے اسی مسئلہ سے متعلق مسلم شریف کی حدیث پر پہلے کبھی لکھا تھا۔ ہم نے بالترتیب ان دونوں ہی مقالات پر تفصیلاً نقد کیا تھا لیکن اسی دوران رامپور جانا ہوا اور ہم نے مولانا موصوف سے زبانی تبادلۂ خیال کیا وہ ہمارے گہرے دوست ہیں اور صالحیت و اخلاص کے اعتبار سے ہم پر کہیں فائق۔ ہمارا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ان سے بھی بحث چھڑے لہٰذا زبانی گفتگو کے ذریعہ کوئی راہ نکالنی چاہی الحمدللہ وہ نکل آئی۔ اب ہم اپنے نقدِ مفصّل کو تو پھاڑے دیتے ہیں اور مختصراً وہ کچھ عرض

کئے دیتے ہیں جس کا عرض کرنا بہر حال ضروری ہے۔

سیمنار والے مقالے میں موصوف نے متعدد احادیث اور آیتِ قرآنی اور فتاوائے صحابہؓ سے استدلال کرنے کے بعد بجا طور پر فرمایا:۔

"ان احادیث نبویؐ و آثارِ صحابہؓ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں:" (زندگی، ص۱۸)

لیکن پھر یہ بھی فرمایا کہ "میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے اور موجودہ صورتحال کو پیشِ نظر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر طلاق دینے والے نے اس خیال کے تحت تین کی صراحت کے ساتھ طلاق دی ہے کہ اس کے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی تو ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جانا چاہیے:"

ہمیں اس نتیجۂ فکر پر اعتراض یہ تھا کہ جب خود ان کے نزدیک احادیث و آثار سے ہر حال میں تین کا وقوع ثابت ہے تو پھر فکر و غور کی اور کون سی بنیاد ہے جس پر خیال کی عمارت اٹھا کر انھوں نے ایک ایسا فیصلہ پسند کیا جس کی کوئی نظیر حدیث و آثار میں نہیں۔ قانون سے ناواقفیت دین اور دنیا کے کسی قانون میں عذرِ معتبر نہیں۔ اگر اسے عذرِ معتبر مان لیں تو قانون کی پوری تعمیر ہی ڈھے جائے ـــــ اوّل تو یہ محض ایک طبع زاد مفروضہ ہے کہ کچھ لوگ یوں تصور کرتے ہیں کہ تین طلاقوں کے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ اس کی جانچ کے لئے کبھی کوئی سروے نہیں کیا گیا۔ دوسرے اس مفروضے کو کسی درجے میں بھی مان لیں تو لوگوں کا جہل کسی فعل کی تاثیر میں آخر رکاوٹ کیسے بن سکتا ہے۔ زید نے بھری ہوئی بندوق کو بھولے سے داغ دیا۔ گولی بکر کے سینے میں لگی۔ کیا آپ یوں کہیں گے کہ چونکہ زید نے قصداً گولی نہیں ماری ہے اس لئے بکر کے زخم کو زخم نہ مانو! ـــــ نہیں کہہ سکتے بہت سے بہت یوں کہہ سکتے ہیں کہ زید قتلِ عمد کا مجرم نہیں۔ اسے معافی ملنی چاہیے یا برائے نام سی سزا بشکلِ جرمانہ ہونی چاہیے۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں۔ ٹھیک اسی طرح تین طلاقیں دینے والے جاہلِ مطلق کو آپ ازراہِ عنایت گناہ گار نہ مانیں تو چلئے نہ مانئے لیکن تینوں طلاقیں تو بہر حال اسی طرح واقع ہو گئیں جس طرح زید کی داغی ہوئی گولی بکر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ جہل و سہو کا اثر مرتکبِ جرم کے قانونی حکم پر تو اثر انداز ہو سکتا ہے

لیکن جرم کے وقوع سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے اس معارضے پر مدیرِ "زندگی" نے غور کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۲) موصوف نے بحث و نظر کے بعد اپنے مقالے میں خیال ظاہر فرمایا تھا کہ تین طلاقوں کے واقع ہو جانے پر جمہور کا دعوۂ اجماع محلِ نظر ہے۔ محلِ نظر ہونے کی درج ذیل تین وجوہ انھوں نے پیش کی تھیں۔

ایک یہ کہ "—— ابن حزمؒ، ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ جیسے اساطینِ اُمت نے اس پر اجماع کا انکار کیا ہے۔"

اس پر ہمیں تحیّر ہوا تھا کیوں کہ ابنِ حزمؒ کا نام یہاں غلط طور پر لیا گیا۔ ابن حزمؒ تو دوسری انتہا پر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تین اکٹھی طلاقیں نہ صرف واقع ہو جاتی ہیں بلکہ وہ بدعت و گناہ بھی نہیں ہیں۔ انھیں طلاقِ سنت کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اگر بیوی کو صرف ایک بار کہے "تجھ پر طلاق" اور نیت تین کی ہو تو ابنِ حزمؒ کی رائے یہ کہ تین ہی پڑیں گی۔ البتہ تین بار کہا اور نیت ایک کی کی تو نیت کا اعتبار نہیں تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ علاوہ ازیں ابنِ حزمؒ نے المحلّٰی میں ان لوگوں کا سخت رد کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ تین کے وقوع پر اجماع نہیں ہے۔ پھر آخر مدیرِ زندگی نے ان کا نام ابنِ تیمیہؒ و ابنِ قیمؒ کے ساتھ کیسے لے دیا۔

اس اعتراض کا جواب موصوف نے ایک دیانتدار بندۂ مومن کی طرح یہ دیا کہ ابن حزمؒ کی المحلّٰی مجھے میسّر ہی نہیں آئی اور ان کا نام خدا جانے کہاں سے نوکِ قلم پر آ گیا۔ ظاہر ہے اس جواب کے بعد گفتگو کی گنجائش کیا رہ گئی تھی۔ اللہ معاف کرے آدمی تو سہو و خطا کا پُتلا ہے۔

(۳) ابنِ رُشدؒ کے تعلق سے موصوف نے مقالہ میں کچھ کہا ہے۔ نیز یہ استدلال بھی فرمایا ہے کہ اہلِ حدیث کا معتد بہ گروہ ایک طلاق واقع ہونے کا قائل ہے لہٰذا اجماع کیسے مانیں۔

اس پر ہم نے مفصل کلام کیا۔ ابنِ رُشدؒ نے بدایۃ المجتہد میں جو کچھ لکھا ہے وہ بجائے خود ناکافی اور کمزور ہے۔ علاوہ اس کے وہ ہوں، ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ ہوں، آج کے اہلحدیث ہوں۔ یہ سب قرونِ اولیٰ سے بہت دور ہیں۔ سات آٹھ سو اور ہزار بارہ سو سال بعد کے کچھ لوگوں کا اختلافِ رائے آخر صحابہؓ اور تابعینؒ اور مجتہدین سلفؒ کے اجماع کا قاطع کیسے

ہو سکتا ہے۔ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ترمذیؒ جیسے قدیم اہلِ حدیث اگر اختلاف کرتے تو بے شک اس کا لحاظ کیا جاتا مگر یہ سب تو جمہورِ امت کے ساتھ ہیں پھر کیا بنتا ہے اس سے کہ بارہ سو سال کے بعد امام شوکانیؒ یا سات سو سال کے بعد ابنِ تیمیہؒ و ابنِ قیمؒ اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا بیٹھیں۔

اس پہلو پر مدیرِ "زندگی" سے ہماری خاصی طویل گفتگو ہوئی۔ مجلس میں عزیزی شمس نوید عثمانی بھی موجود تھے —— مدیر زندگی کا اجماع میں شبہ کرنا ظاہراً معقولیت کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ وہ بجا طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سیکڑوں سال سے اہلِ علم اپنی کتابوں میں اختلاف کا ذکر کرتے ہی آ رہے ہیں اور علمائے خلف کی کتابیں بھی اس ذکر سے خالی نہیں۔

واقعی ایسی صورتِ حال میں یہ سمجھنا ہی چاہیے کہ مسئلہ کسی درجے میں اختلافی ہے۔ لیکن ہم نے انھیں بتایا کہ یہ فتنے اور اختلاف کا بیج دراصل خوارج اور روافض کا بویا ہوا ہے۔ دس بارہ نام جو بعض کتابوں میں اختلاف کرنے والوں کے درج ہو گئے ہیں وہ سب دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ جہاں تک صحابہؓ کا تعلق ہے ان میں سے تو کسی ایک کی طرف بھی اختلاف کی نسبت کذب و افترا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سفید جھوٹ۔ باقی ناموں میں اکثریت ان کی ہے جو اجتہاد و تفقّہ کے بازار میں پھوٹی کوڑی کی بھی قیمت نہیں رکھتے۔ رہے ایک دو وہ نام جن کی واقعی کوئی اہمیت ہے تو ان کی طرف اختلاف کی نسبت ہی درست نہیں۔ قوی سندوں سے نقل کا کہیں پتہ نہیں۔ البتہ اجماع ثابت کرنے والی نقلیں قوی ترین اور کثیر سندوں سے مروی ہیں جنھیں جھٹلانا کسی واقف فن کے لئے ممکن ہی نہیں۔

ہم زبانی جس حد تک عرضِ مدعا کر سکتے تھے کر گزرے اور مدیر زندگی کی اعلیٰ ظرفی کو مرحبا کہ انھوں نے بہت ٹھنڈے دل سے سب کچھ سنا۔ فضا انتہائی دوستانہ اور خوشگوار رہی۔ اور انھوں نے وعدہ فرمایا کہ تجلّی کا طلاق نمبر دیکھنے کے بعد وہ مزید غور و فکر کریں گے۔ یہی ایک طالبِ حق کو زیب بھی دیتا ہے۔ ضد، پیچ اور دھاندلی تو بندگانِ ہوا و ہوس کا شیوہ ہے۔

موصوف کا دوسرا مقالہ جس کا تعلق مسلم شریف کی ایک حدیث سے ہے بہت اچھا ہے اس کے سلسلے میں ہمیں بس اتنا ہی کہنا تھا کہ اس کے بعض الفاظ سے فقہاءؒ کی تحقیر و تخفیف ہوتی ہے۔ اپنے دوست کے آگے ہم نے ان الفاظ کی نشاندہی کی اور عرض کیا کہ خدارا فقہاءؒ کی بدظنی دل سے نکال دیجیے۔ فقہاءؒ پر طعن و طنز آج کل فیشن ہے حالانکہ ہزاروں ہزار

رحمتیں ہوں فقہائے سلفؒ پر انھوں نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس کی قدر و قیمت اُخروی نقطۂ نظر سے سائنس کے عظیم تر کارناموں سے بھی بڑھ کر ہے۔ انھوں نے اپنی عمریں قانونِ شریعت کی تدوین و تہذیب میں لگادیں اور ان کے بارے میں سوءِ ظنی یا تو جہلا ر کا کام ہو سکتا ہے یا بدعقلوں کا۔

یہ پروپیگنڈہ بھی بجو اس کے سوا کچھ نہیں کہ فقہاؒ غیر ضروری موشگافیاں کرتے ہیں اور دین کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ استغفراللہ!۔ ایسا پروپیگنڈہ کرنے والے دراصل اپنی کم عقلی اور نارسائی پر پردہ ڈالتے ہیں۔ نیز یہ پروپیگنڈہ بھی تہمت تراشی کے سوا کچھ نہیں کہ فقہاؒ قرآن و حدیث سے زیادہ قیاس و منطق کے پیچھے چلتے ہیں۔ دس بار استغفراللہ۔ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ جملہ مستند فقہاؒ اللہ اور رسولؐ کے سچے غلام ہیں۔ اکدم مطیع و فرماں بردار۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ اللہ اور رسولؐ ہی کی ترجمانی اور نمائندگی ان کا وظیفۂ حیات ہے۔ البتہ فرق ان کا یہ ضرور ہے کہ اللہ نے انھیں زیادہ باریک بیں اور درّاک قسم کی عقل و ذہانت عطا کی تو انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ اسے جمود و غفلت کا شکار نہ ہونے دیں بلکہ دین کی خدمت اور قانونِ شریعت کی آرائش میں صَرف کریں۔ یہ قصور موٹی عقل والوں اور سطح بینوں اور ظاہر پرستوں کے نزدیک کتنا ہی سنگین ہو مگر مدیرِ زندگی جیسے باہوش صالحین کو اس پر شکرِ نعمت ہی ادا کرنا چاہیئے نہ کہ بدظنی اور کدورت کا مظاہرہ۔ حق یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو فقاہت اور ژرف نگاہی سے نہ نوازتا تو قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے بھی دین کھلونا بن جاتا۔ حقائق پر گرد کی تہیں چڑھ جاتیں۔ عقائد کا حلیہ بگڑ جاتا۔ ہزار ہزار درود و سلام اس آخری پیغمبرؐ پر جس کی امت میں مفسرینؒ و محدثینؒ کے پہلو بہ پہلو اعلیٰ درجے کے مجتہدین اور اربابِ تفقہؒ بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے رہے ہے۔ ان کا احسان قیامت تک تمام افرادِ امّت پر ہے بشرطیکہ یہ امت ناشکری اور محسن کشی پر نہ اُتر آئے۔

بہرحال ہم نے مدیرِ زندگی کے آگے اپنے ناچیز خیالات رکھدیئے اور ہمیں مسرت ہے کہ انھوں نے بڑے تحمّل اور خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں سنا ہمارا مشورہ یہ بھی تھا کہ آپ تقلید کو دانتوں سے پکڑیں جیسا کہ ہم نے پکڑ رکھا ہے۔ اجتہاد کا درجہ بہت بلند ہے۔ مولانا مودودیؒ جیسے عظیم مفکر اور عالم و فاضل بزرگ بھی فقط دو چار ہی مسئلوں میں اس درجۂ بلند کی حدوں کو چھو سکتے ہیں ورنہ باقی تمام مسائل میں وہ برضا و رغبت تقلید ہی کے خوگر اور قائل ہیں۔ اور

یہی راہِ نجات ہے۔ ہم بھلا چہ پدّی چہ پدّی کا شوربہ۔ اسی طلاقِ ثلٰث کے مسئلہ کو دیکھ لیجئے کتنے ذیل در ذیل گوشے۔ کتنے باریک پہلو۔ کتنا گونا گوں مواد۔ مقالہ نگاروں نے دس پانچ کتابیں دیکھ کر فیصلے دے ڈالے حالاں کہ یہ ایسا ہی تھا جیسے آدمی تالاب میں تیر کر بحرالکاہل فتح کر لینے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ تحمل!۔ اے پیارے دوستو اور بزرگو بہت زیادہ تحمل! اہلِ قرآن اور اہلِ حدیث جیسے عنوانات تراش لینا بہت آسان ہے لیکن قانونِ شریعت کی تہوں میں اترنا اور گہرائیوں سے قیمتی موتی لانا سخت دشوار۔ تقلید تو بہرحال ناگزیر ہے۔ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ یا احمدؒ کی تقلید نہیں کروگے تو ابن تیمیہؒ، ابنِ قیمؒ، ابنِ حزمؒ، علامہ شوکانیؒ اور فلاں ابنِ فلاں کی کروگے۔ آدمی کا فیصلہ کُن مقدّر تقلید ہی ہے۔ مجتہد ہونا سب کا نصیب نہیں۔ سونا اور یاقوت و جواہر کنکر پتھر کی طرح عام نہیں ہو سکتے۔

ہمارے مہربان دوست نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہماری حقیر معروضات پر برابر غور کرتے رہیں گے۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان سے بحث کریں۔ ہم تو دوسرے مقالہ نگاروں سے بھی بحث نہ کرتے اگر ان کے مقالات علم و تحقیق کے لئے باعثِ ننگ نہ ہوتے۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تین طلاقوں کے بارے میں

آیات اور احادیث
اور
صحابہؓ کے
فتوے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃُ البقرہ میں ارشاد کیا گیا ہے۔
اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (طلاق تو بس دو ہی بار ہے۔ اس کے بعد یا تو میاں بیوی کو رجوع کر کے روک لیا جائے بھلے طریقے سے یا بھلی طرح چھوڑ دیا جائے۔

تمام مستند مفسرین آیت کی شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام سے قبل اہلِ عرب کا دستور یہ تھا کہ جتنی بار چاہے بیوی کو طلاق دو اور رجوع کر لو۔ طلاق کا کوئی عدد ایسا نہ تھا کہ جس کے بعد رجوع نہ ہو سکے اللہ نے قانون بیان فرمایا کہ رجوع صرف دو طلاقوں تک ہو سکتا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ
(دو کے بعد اگر تیسری بھی دے دی تو اب یہ عورت طلاق دینے پر حلال ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ کسی اور سے نکاح نہ کر لے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مَرَّةٌ (ایک مرتبہ) اور مَرَّتَيْن (دو مرتبہ) کا استعمال عرب میں ایسے موقع پر بھی ہوتا ہے جب کوئی فعل الگ الگ کیا جائے۔ اور ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب اوقات کا فرق نہ ہو۔ اس کی مثالیں بھی ہم قرآن سے دے آئے۔ یہاں ایک اور مثال ذہن میں آئی۔ معجزۂ شقُ القمر کے بارے میں بخاری میں تین مختلف صحابیوںؓ سے روایت منقول ہے۔ پہلی عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:
قال انشق القمر علی عهد النبی صلی اللہ علیه وسلم شقتین۔
ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں چاند دو برابر کے ٹکڑوں میں شق ہو گیا تھا دو برابر کے ٹکڑے ہو جانے کے لیے ایک روایت میں فِرْقَتَيْن آتا ہے۔ ایک میں فَلْقَتَيْن مگر مسلم کی ایک روایت میں مَرَّتَيْن ہے۔ اب اس سے بعض اناڑیوں نے

یہ سمجھ لیا کہ یہ شقّ قمر کا معجزہ دوبار صادر ہوا ہے جیسے کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں ہمارے دوست یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دو الگ الگ طلاقوں کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ مگر مستند اور معروف محدثینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ میں کوئی ایسا نہیں جس نے یہ یقین کیا ہو کہ شقّ قمر دوبار ہوا۔ بلکہ مَرَّتَیْن سے مراد شقتین ہی لیتے ہیں یعنی دو ٹکڑے۔ اب دیکھ لیجیے شقّ قمر کا فعل اور واقعہ ایک ہی ہے گویا مَرَّةً وَّاحِدَةً مگر اثرِ فعل کی مشاہداتی کیفیت کے اعتبار سے بعض اہلِ زبان نے اس کے لیے مَرَّتَیْن کا لفظ استعمال کر لیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ مَرَّتَیْن کے واحد معنی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ فعل دو مرتبہ الگ الگ واقع ہو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ایک اور استدلال یہاں ابنِ قیمؒ وغیرہ سے منقول ہے اسے بھی دیکھ لینا چاہیے۔ استدلال یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ یعنی طلاق دوبار ہے مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ (ایک کے بعد ایک) پھر فرمایا گیا فَاِنْ طَلَّقَهَا یعنی ایک کے بعد ایک طلاق دینے کے بعد اگر تیسری بار طلاق دی تو یہ عورت حلال نہ ہو گی، جب تک کسی اور سے نکاح نہ کرلے۔ اس ترتیب اور نظمِ کلام سے ظاہر ہوا کہ عورت کو حرام کرنے والی وہی تیسری طلاق ہو سکتی ہے جو اسوقت دی جائے جب پہلے ایک کے بعد ایک طلاق دی جا چکی ہو۔ گویا تیسری طلاق کو اس وقت آنا چاہیے جب دو طلاقیں الگ الگ واقع کی جا چکی ہوں۔

یہ استدلال بڑا ظاہر فریب ہے اور ظلم ہو گا اگر اس کے پیش کرنے والوں کی ذہانت کو داد کا تحفہ نہ دیا جائے۔ لیکن تحفہ پیش کرنے کے بعد ہم ادب کے ساتھ گزارش کریں گے کہ بزرگوا اگر یہی بات ہے تو پھر یہ بھی تو ثابت ہوا کہ طلاق سے رجوع ایک طلاق کے بعد نہیں ہو سکتا بلکہ دو طلاقوں کے بعد ہو سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا طلاق دوبار ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسکے بعد جو بھی حکم آ رہا ہے وہ اسی وقت مؤثر اور قابلِ عمل ہو سکتا ہے جب ایک کے بعد ایک کرکے دو طلاقیں واقع کر دی جائیں تو اسکے بعد جس طرح تیسری طلاق کا حکم بیان ہوا ہے اسی طرح فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ بھی بیان ہوا ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایک طلاق کے بعد بھی رجوع کر سکتے ہو۔ بلکہ یہ فرمایا گیا کہ طلاق دوبار ہے اس کے بعد یا تو رجوع ہے یا چھوڑ دینا ہے۔ لہٰذا جس دلیل سے آپ یہ واجب کر رہے ہیں کہ تیسری طلاق اسی وقت واقع ہو سکتی ہے جب دو طلاقیں اس سے قبل دو مرتبہ دی جا چکیں۔ اسی دلیل سے یہ بھی واجب ہوتا ہے کہ رجوع اس وقت کیا جائے جب ایک کے بعد ایک کرکے دو طلاقیں دی جا چکیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ آپ یہ قول نہیں کرتے کہ تمام علمائے اُمّت کی طرح یہ مانتے ہیں کہ رجوع ایک طلاق کے بعد بھی اسی طرح درست ہے جس طرح دو طلاقوں کے بعد۔ ؟ اگر اپنے استدلال کی صحت پر آپ کو بھروسہ ہے تو پھر اس استدلال سے جو کچھ نتائج برآمد ہوں ان سب کو صدق دلی سے قبول فرمائیے۔ یہ کیا کہ طلاق کے معاملہ میں تو قبول میں پیش پیش ہیں لیکن رجوع کے معاملہ قبول سے صاف انکار۔

ثابت ہوا کہ یہ استدلال ہی درست نہیں۔ اگر درست ہوتا تو اس سے یہ غلط نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا تھا کہ فقط ایک طلاق کے بعد رجوع ممکن نہیں دو ہی کے بعد اجازت ہو گی۔

ہمارے بزرگ اگر یہ کہیں کہ ایک طلاق کے بعد رجوع کا جواز ہم کسی اور خارج از قرآن دلیل سے مثلاً حدیث یا آثارِ صحابہؓ یا قیاس سے نکالتے ہیں تو ہم بھی عرض کریں گے۔ کہ پھر حضور کو ہم نیازمندوں کے اس طرزِ عمل پر خفگی کیوں ہے کہ تین اکٹھی طلاقوں کے وقوع کا ثبوت ہم حدیث آثار اور قیاس سے فراہم کرتے ہیں۔

علاوہ اس کے آپ کے استدلال اور آپکے دعوے میں ایک تضاد اور ہے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ مجلسِ واحد میں تین طلاقیں پڑتی ہی نہیں لیکن آپ کا استدلال تقاضا کر رہا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق، تجھ پر طلاق، تجھ پر طلاق" تو تینوں کو پڑجانا چاہیے۔ کیونکہ تیسری طلاق اسی وقت واقع کی گئی ہے جب دو طلاقیں ایک کے بعد ایک کرکے ڈالدی گئیں۔ یہ عین وہی ترتیب ہے جو آپ نے قرآن سے اخذ کی۔ اس ترتیب کے پائے جانے پر بھی آپ کا یہ کہے جانا کہ ایک ہی طلاق پڑی واضح کرتا ہے کہ آپ کا استدلال محض ایک مغالطہ ہے۔ جسے آپ فریقِ ثانی کے خلاف بطورِ حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ دو اور دو چار۔ اگر حساب کا صحیح فارمولا ہے تو اپنے اور بیگانہ دونوں کے لیے صحیح مانیے ایسا نہ کیجیے کہ جب وصول کریں تو چار وصول کریں اور جب ادا کریں تو کہدیں کہ دو اور دو تین ہوتے ہیں۔

اے بزرگانِ کرام، مقالہ نگارانِ عظام!! واحد سچائی یہ ہے کہ قرآن طلاقوں کی ترتیب نہیں تعداد بیان کر رہا ہے۔ وہ یہ بیان کر رہا ہے کہ کتنی طلاقوں تک مرد کو حقِ رجوع رہتا ہے اور کتنی طلاقوں کے بعد نہیں رہتا۔ طلاق تو مرد کا حق ہے جسے وہ نکاح کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اسے وہ الگ الگ استعمال کرے یا دفعتاً کر ڈالے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے آپ اپنے تین روپیوں کو

تین مختلف وقتوں میں صرف کریں یا ایک ہی وقت میں ایک ہی سودا خرید ڈالیں۔ دونوں صورتوں میں یہ روپے آپ کی ملک سے خارج ہو جائیں گے۔ فرض کیجیے آپ اپنے جائز طور پر کمائے ہوئے ہزار روپے گناہ کے کاموں میں صَرف کر دیتے ہیں یا اُن کے انار پٹاخے خرید کر گھر پھونک تماشا کر گزرتے ہیں تو یہ حلال کام نہیں ہوا۔ اللہ اور رسولؐ نے اس سے روکا ہے لیکن ممنوع ہونے کی وجہ سے یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تلف شدہ رقم یا اس کا کوئی حصہ ابھی آپ کی ملک رہا۔ رقم تو گئی، اس پر آپ کا حق تصرّف بھی ختم ہوا بس اسی طرح تین طلاقیں دفعتاً دے ڈالنا بے شک کارِ ممنوع ہے۔ گناہ ہے۔ لیکن جب دے ڈالیں تو آپ کا حق ختم ہو گیا۔ بات اللہ کے رسولؐ نے آپ ہی کی فلاح کے لیے بتائی تھی کہ طلاق میں جلد بازی مت کرو۔ سوچ سمجھ کر دو اور ایک سے زائد دینی ہیں تو ایک ایک ماہ کے بعد دو تاکہ تمھیں سوچنے سمجھنے کا اور رجوع کا موقعہ رہے۔ یہ ایسی ہی ہدایت تھی جیسے اللہ اور رسولؐ یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ فضول خرچی مت کرو۔ پیسہ غلط کاموں میں مت اُڑاؤ۔ اب اگر آپ ہدایت کو نظر انداز فرما کر کھٹا کھٹ تین طلاقیں جھونک دیتے ہیں تو اس کا کیا مطلب کہ رجوع یا مزید کسی طلاق کا حق آپ کے پاس پھر بھی باقی رہے۔ فضول خرچی کی راہ میں جو پیسہ آپ نے اڑا دیا وہ تو اُڑ گیا۔ اب اس پر آپ کا حق کہاں؟ دونوں معاملات یکساں ہیں اور ان میں فرق کرنا سوائے خطا پر اصرار کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

○

اب آئیے قرآن کے دوسرے مقام کی طرف۔ قرآن کی ۶۵ ویں سورۃ الطّلاق ہے اس کا آغاز ہی اس طرح پر ہوا ہے کہ "اے نبیؐ اگر تم بیویوں کو طلاق دو تو اس طرح پر دو"۔ ظاہر ہے کہ نبیؐ کو خطاب کر کے تمام ہی مسلمانوں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوا کہ طلاق اس طرح دو جس سے عدّت کے شمار میں خرابی واقع نہ ہو۔ مفسّرین نے اس کی تفسیر یہ بتائی کہ نہ تو حالتِ حیض میں دو نہ اس طہر میں جسمیں تم نے بیوی سے صحبت کر لی ہو۔ پھر زمانۂ عدّت میں اُنہیں گھروں سے مت نکالو وغیر ذالک ان آیات کو جس کا جی چاہے کسی مترجَم قرآن میں دیکھ لے۔ ہدایات دینے کے بعد اللہ فرماتا ہے جو شخص اللہ کی مقرّر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ پھر فرماتا ہے۔ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ (شاید اس کے بعد اللہ (موافقت) کی کوئی صورت پیدا کرے۔

اب یہاں ہم مولانا مودودیؒ کے الفاظ مستعار لیں گے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ دونوں فقرے ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید کرتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ حیض کی حالت میں طلاق دینے یا بیک وقت تین طلاق دے دینے سے کوئی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی رائے کو بھی غلط ثابت کر دیتے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاق ایک ہی طلاق کے حکم میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بدعی طلاق واقع ہی نہیں ہوتی یا تین طلاق ایک ہی طلاق رجعی کے حکم میں ہیں تو یہ کہنے کی آخر ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ جو اللہ کی حدود، یعنی سُنّت کے بتائے ہوئے طریقے کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا، اور تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی صورت پیدا کر دے؟ یہ دونوں باتیں اسی صورت میں بامعنی ہو سکتی ہیں جب کہ سنت کیخلاف طلاق دینے سے واقعی کوئی نقصان ہوتا ہو جس پر آدمی کو پچھتانا پڑے اور تین طلاق بیک وقت دے بیٹھنے سے رجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو طلاق واقع ہی نہ ہو اس سے حدود اللہ پر کوئی تعدّی نہیں ہوتی جو اپنے نفس پر ظلم قرار پائے۔ اور جو طلاق بہر حال رجعی ہی ہو اس کے بعد تو لازماً موافقت کی صورت باقی رہتی ہے۔ پھر یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ شاید اس کے بعد اللہ موافقت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

(تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۵۶۵)

یہ تقریر کلام شرح و تبصرہ سے بے نیاز ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ ہمارے بعض کم تعلیم یافتہ قارئین اس کے بعض الفاظ کا مطلب نہ سمجھیں اس لیے ہم کچھ وضاحت بھی کیے دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہ ہدایت فرما رہا ہے کہ اول تو تمھارے لیے یہ مناسب ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی طلاق دو تاکہ رجوع اور مصالحت کا امکان باقی رہے۔ **دوسرے ایسے اوقات** میں طلاق دو کہ عدّت کا شمار ٹھیک ہو سکے۔ **مثلاً حیض میں دوگے تو اس کا مطلب** یہ ہو گا کہ عورت کی مدّت عدّت بڑھ جائے۔ اور طُہر میں جماع کے بعد دوگے تو یہ بات مشتبہ ہو جائے گی کہ عدّت کا شمار طہروں یا حیضوں کے اعتبار سے ہو یا حمل کے اعتبار سے کیوں کہ عین **ممکن ہے اس جماع سے عورت حاملہ ہو جائے اور حاملہ کی عدت معلوم ہی ہے کہ وضعِ حمل ہے۔**

بہر حال اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن حالتوں میں طلاق دینے سے اللہ منع کر رہا ہے

ان حالتوں میں اگر طلاق دی جائے تو وہ پڑ جائے گی نہ پڑے تو ان نقصانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن سے بچانے کے لیے اللہ ہدایات دے رہا ہے۔ کسی برائی سے روکنے کا مطلب ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ اگر اس کا ارتکاب کیا گیا تو وہ اثرات پیدا کر کے رہے گی۔ قتل ناحق کو منع کیا گیا۔ نہ منع کیا جاتا۔ اگر قانونِ فطرت یہ ہوتا کہ تلوار یا بندوق صرف ایسے ہی لوگوں کو قتل کر سکے گی جو واقعی مستحق قتل ہوں اور جن لوگوں کو ناحق قتل کیا جا رہا ہے وہ قتل ہو ہی نہیں سکتے اللہ تعالیٰ کا ہدایات دینا ہی اپنی جگہ دلیلِ ناطق ہے اس بات کی کہ خلافِ ہدایات طریقوں سے طلاق دینا غلط نتائج پیدا کرے گا۔ یعنی طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ حکم الٰہی کی نافرمانی کا گناہ سر پر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (جس نے اللہ کی حدوں سے تجاوز کیا اس نے اپنے ہی نفس پر ظلم کیا) یہاں مسئلہ طلاق کے سلسلہ میں یہ کلمات فرمائے گئے ہیں اور اللہ نے جو حدیں قائم کی ہیں وہ یہی تو ہیں کہ عورت بے چاری پر ایسے وقت میں طلاق نہ پڑے کہ عدّت کا صحیح شمار نہ ہو سکے اور ایسے انداز میں بھی نہ پڑے کہ رجوع و مصالحت کا امکان ختم ہو جائے۔ کوئی شخص سورۂ بقرہ کا حوالہ دے کر زیادہ سے زیادہ یہی تو کہہ سکتا ہے کہ اللہ نے الگ الگ طلاق دینے کی ہدایت فرمائی اور حدیث کے ذریعہ اس الگ الگ کی تفصیلی شکل بھی معیّن کی جا سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہدایات کے خلاف طلاق دینے سے خود بیانِ قرآنی کے مطابق اللہ کی حدوں سے تجاوز ہو جاتا ہے یعنی طلاق پڑ جاتی ہے۔ اسی بات کو صاحبِ تفہیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اگر خلافِ ہدایت طریقے سے طلاق واقع ہی نہ ہو تو "اس سے حدود اللہ پر کوئی تعدّی نہیں ہوتی۔" طلاق اگر نہ پڑے تو ظلم ہوا ہی کہاں؟ ظلم تو ایک ایجابی شئے ہے۔ نہ پڑنے کی صورت میں عدم ہی عدم اور سلب ہی سلب ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ "فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ کا تعلق متعدّد امور سے ہے نہ صرف طلاق لغیر العدّۃ سے اور صحیح مفہوم یہی ہے کہ حدودُ اللہ کی خلاف ورزی کرنے والا گنہگار اور عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔ ظلم نفس کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم اللہ کی نافرمانی کر کے اپنے نفس کی حق تلفی کرنے اور اسے ہلاکت میں ڈالنے کے مفہوم میں آیا ہے اور یہی مفہوم یہاں بھی ہے۔ اس سے کسی قانونی حکم کا استخراج صحیح نہیں۔"

(یہ مولانا حامد علی کے الفاظ ہیں) ان حضرات کی پہاڑ جیسی غلطی یہ ہے کہ صرف تین طلاقوں کے

پڑنے نہ پڑنے میں بحث کرتے ہیں لیکن یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حالت حیض میں یا اس طہر میں جس میں صحبت کر لی گئی ہو ایک طلاق پڑ جاتی ہے۔ حالانکہ اگر تین اکٹھی خلاف سنت ہونے کی وجہ سے نہیں پڑتیں تو مذکورہ دونوں حالتوں میں **طلاق** دینے کی مخالفت تو عینِ قرآن سے اجمالاً اور قولِ رسولؐ سے صریحاً طے پا چکی ہے۔ پھر یہ حضرات شیعوں کے فرقۂ امامیہ کا مسلک کیوں قبول نہیں کر لیتے کہ کوئی طلاق نہیں پڑے گی۔ ایسا کر لیں تو ہمیں ان سے بحث ہی نہ رہے۔ مگر یہ حضرات یہاں تو یہ مانتے ہیں ——— اور ماننے بغیر چارہ بھی نہیں ہے کہ باوجود خلافِ سُنّت ہونے کے طلاق پڑ جائے گی۔ اور تین طلاقوں کے وقوع میں یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ یہ خلاف سُنّت ہیں اس لیے نہیں پڑیں گی۔ آخر یہ کس قسم کی معقولیت ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ کا تعلق متعدّد امور سے سہی مگر سب سے پہلے اور قطعًا منصوص طور پر اس امر سے بہر حال ہے کہ ہدایت کے مطابق طلاق دو ورنہ اپنا ہی نقصان کرو گے۔ اس جگہ مردوں کے لیے بطورِ ہدایت صرف تین امور بیان ہوئے ہیں۔

(۱) عورتوں کو ان کی عدّت کے لیے طلاق دو (۲) عدّت کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔
(۳) مطلّقہ کو گھر سے نہ نکالو، اِلّا یہ کہ وہ فحش کی مرتکب ہو۔

ہم کب کہتے ہیں کہ آیت کا مذکورہ فقرہ ان تینوں ہی سے متعلق نہیں ہے لیکن تینوں سے متعلق ہونے کی بنا پر یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ نافرمانی کرو گے تو بس گناہگار تو ہو گے عمل مؤثر نہ ہوگا۔ کیا کوئی بدبخت عدّت میں بے قصور عورت کو گھر سے نکال دے تو آپ یوں کہیں گے کہ چونکہ یہ حرکت ظلم و گناہ ہے اس لیے ہم عورت کو گھر سے نکلا ہوا نہیں مانتے! **اخراج کا عمل بہر حال** متحقق ہوا اسی طرح تین طلاقیں متحقق ہو جاتی ہیں۔

اور آیت کا جو مفہوم یہ حضرات بیان کر رہے ہیں وہ سر آنکھوں پر۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ تین اکٹھی طلاقیں دینا گناہ ہے۔ لیکن یہ اگر واقع نہ ہوں تو حق تلفی کس کی ہوئی اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کہاں ہوا؟ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں واقع کرنے کو اللہ اور رسول منع کریں حالانکہ ان حضرات کے دعوے کے مطابق یہ واقع ہی نہ ہو سکتی ہوں تو کیا اللہ اور رسولؐ عبث اور لایعنی ہدایات بھی جاری کر سکتے ہیں (نعوذ باللہ من ذالک)

خلاصہ یہ کہ صاحبِ تفہیم نے قرآن سے بالکل صحیح استدلال کیا اور یہی استدلال صحابہؓ و ائمہؒ سے چلا آرہا ہے۔

یہاں ہمیں ضمناً ایک اور بات تفہیم القرآن کے تعلق سے کہنی ہے۔ مولانا مودودی نے مفسّرین سلف کی طرح مرجوح اور اختلافی اقوال بھی ذکر کیے ہیں۔ ان ہی میں ایک یہ بھی ہے کہ "سعید بن المسیّبؒ اور بعض دوسرے تابعینؒ کہتے ہیں کہ جو شخص سُنّت کے خلاف حیض کی حالت میں طلاق دے دے اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی یہی رائے امامیہ کی ہے۔"

اس کے لیے صاحبِ تفہیم نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ سعید بن المسیّبؒ کی طرف اس رائے کی نسبت مشکوک ہے۔ مصنف عبدالرزّاق میں ان کا مسلک یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص قبل از صحبت منکوحہ کو تین طلاق دے تو تین ہی پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر تجدیدِ تعلق ممکن نہ ہوگی۔ اس روایت کی سند قوی ہے (عَنْ معمّر عَنْ قتَادَۃَ عَنْ سَعِیدِ بْنِ الْمُسَیِّبْ) بے شک بات غیر مدخولہ کے تعلق سے کہی گئی ہے لیکن ایک وقت کی تین طلاقوں کے وقوع پر تو ان کا اعتراف و اتفاق سامنے آ گیا ـــــ اگر کسی بھی صورت میں اکھٹی تین پڑ سکتی ہیں تو کیسے مان لیں کہ ان کے نزدیک مدخولہ پر ایک بھی نہیں پڑے گی۔ کاش حوالہ مل جاتا تو دیکھتے کہ سند کیسی ہے۔

رسول اللہؐ کے فتوے

سیّد الانبیاء رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ مبارکہ کو اصطلاحاً فتویٰ نہیں کہا جاتا، ان کی تعلیماتِ دین کا نامِ نامی تو "شریعت" ہے۔ لیکن یہاں ہم چونکہ صحابہؓ وغیرہ کے فتاویٰ پیش کر رہے ہیں اس لیے اسی عنوان کے تحت احادیث کو بھی لے لیتے ہیں۔ حدیثوں اور فتووں کا کافی تذکرہ دورانِ بحث میں تو آ ہی گیا ہے۔ لیکن ضروری معلوم ہوا کہ یہ لعل و گہر ڈھیر سے الگ کر کے ترتیب کے دھاگے میں پرو دیے جائیں تاکہ جو لوگ پوری بحث نہ پڑھ سکیں وہ بھی ایک نظر میں دیکھ لیں کہ اکھٹی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے سے نہ صرف صحابہؓ بلکہ شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بھی مخالفت کس درجے میں ہوتی ہے۔ اختصار کے خیال سے ہم صرف اردو ترجمے پر اکتفا کریں گے اور اصل کا حوالہ ساتھ ساتھ دے دیں گے تاکہ جس کا جی چاہے اصل اور ترجمہ ملا لے۔

حضورِ رسالت مآبؐ کا فیصلہ نمبر (۱)

"صحابیٔ رسولؐ معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی شخص بدعت کے

طریقے سے ایک یا دو یا تین طلاقیں دے گا اس کی بدعت ہم اس پر لازم کر دیں گے۔"

(دارِ قطنی ص۴۴۳ و ص۴۴۴)

طلاق کا مسنون طریقہ حضورؐ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس طُہر کے زمانے میں دو جس میں صحبت نہ کی ہو۔ اگر تین دینی ہوں تو ایسے ہی تین طہروں میں دو۔ حالتِ حیض میں طلاق دینا بدعت ہے اور طہر میں صحبت کے بعد طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ ایک وقت میں دُو یا تینؔ طلاقیں دینا بھی بدعت ہے۔ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ جو شخص ہماری نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے طلاق دینے میں بدعت کا طریقہ اختیار کرے گا۔ اس پر ہم اس کی بدعت لازم کر دیں گے یعنی طلاق کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ صحیح احادیث میں واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ نے غلطی سے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دے دی تو حضورؐ نے اسے جاری کر دیا۔ البتّہ ایک طلاق چونکہ رجعی ہوتی ہے اس لیے رجوع کا بھی حکم دے دیا۔ اسی لیے تمام اہلِ سُنّت بھی اس پر متفق ہیں کہ چاہے حیض میں طلاق دو چاہے اس طہر میں جس میں صحبت کر لی ہو طلاق پڑ جائے گی۔ بھلا جب کوئی شخص ایک وقت میں تین طلاقیں دے بیٹھے تو اس کے نہ پڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ حضورؐ جس حکم کو جاری کر دیں وہ تو عین شریعت ہے۔ تین طلاقیں اکھٹی دینا بدعت ہے اور حضورؐ انہیں جاری کر رہے ہیں۔ پھر کیسے ہماری یہ مجال ہے کہ اس اجراء اور نفاذ کو روک سکیں۔ ہمارے فتوے اور رائے سے رسول اللہؐ کا حکم تو مسترد نہیں ہو سکتا۔

حضورِ پُرنورؐ کا فیصلہ نمبر (۲)

صحابیٔ رسولؐ حضرت رُکانہؓ بیان کرتے ہیں؛

"انھوں نے اپنی بیوی سُھَیمَۃ کو طلاق بتّہ دی۔ پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کر کے کہ میں نے طلاقِ بتّہ دی ہے اللہ کی قسم کھائی کہ میری نیّت ایک ہی طلاق کی تھی۔ حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ کیا واقعی تم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہو؟ رکانہؓ نے عرض کیا، بے شک یا رسول اللہ! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک ہی کا ارادہ تھا۔ اب رسول اللہؐ رجوع کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں۔

(یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، حاکم، ابنِ حبّان اور دارقطنی سب نے

روایت کی ہے۔ ہم نے اس کے الفاظ مشکوٰۃ شریف سے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو باب الخلع والطّلاق فصل ثانی۔

تفصیلی گفتگو اس حدیث پر ہو چکی جو اس گفتگو کو نہ دیکھے وہ بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت رکانہؓ نے تین طلاقیں نہیں دی تھیں بلکہ طلاقِ بتّہ دی تھی۔ یعنی یا تو یوں کہا تھا کہ تجھ پر طلاق بتّہ یا لفظ طلاق جوش میں تین بار زبان سے نکال گئے تھے تین کا عدد نہیں بولا تھا اب انھیں پچھتاوا ہوتا ہے غم ہوتا ہے کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ تین اکٹھی طلاقیں بھی شرعاً تین ہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا کیا کریں؟ سمجھ میں آیا کہ میں نے تین کا لفظ تو بولا نہیں کیونکہ میری نیت تین کی تھی ہی نہیں چلو رسول اللہؐ سے عرضِ حال کریں شاید کوئی گنجائش نکلے۔ یہی سوچ کر دوڑے آتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ! میری نیّت ایک ہی کی تھی۔ حضورؐ کے علم میں ہے کہ میرے صحابیؓ کم سے کم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر بہرحال انسان ہیں۔ دوبارہ تو قسم کھلواؤ آپ پھر قسم کھلواتے ہیں۔ گنجائش اس لیے ہے کہ طلاقِ بتّہ کے الفاظ طلاق مغلّظ کے لیے صریح نہیں اگر صریحاً تین طلاقیں دی گئی ہوتیں تو نہ تو رکانہؓ دوڑے آتے اور قسمیں کھاتے نہ حضورؐ نیّت پر قسم لیتے۔ ثابت ہوا کہ رجوع کی اجازت تین طلاقوں پر نہیں ملی ایک پر ملی اور نیت اگر تین کی ہوتی تو تین ہی پڑ جاتیں رجوع کی اجازت نہ ملتی۔ اگر یہ نہ مانا جائے تو نعوذ باللہ یہ ماننا ہوگا کہ صحابیؓ کا قسم کھانا اور رسولُ اللہؐ کا دوبارہ قسم لینا فضول ہی تھا۔ کارآمد تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب نیّت پر فیصلے کا مدار ہو۔

رسُولُ اللہؐ کا فیصلہ نمبر (۳)

حضرت عمرؓ کے صاحب زادے عبداللہؓ اپنی بیوی کو غلطی سے حالتِ حیض میں ایک طلاق دے بیٹھتے ہیں۔ حضورؐ اس پر ناراض ہو کر رجوع کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں عبداللہ ابنِ عمرؓ حضورؐ سے دریافت کرتے ہیں:۔

"یا رسول اللہؐ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوتیں تو فرمائیے کہ کیا رجوع کرنا میرے لیے جائز ہوتا؟ —— حضورؐ نے جواب دیا نہیں۔ اس صورت میں بیوی تجھ سے جدا ہو جاتی اور تیرا یہ فعل (تین طلاقیں ایک دم واقع کرنا) گناہ ہوتا (دارِ قطنی، بیہقی، طبرانی، مصنّف ابوبکر ابن ابی شیبہ، مصنّف عبدالرزاق، فتح الباری، تفہیم القرآن۔ الگ الگ جلد اور صفحات

کا حوالہ اس لیے ضروری نہیں کہ سبھی محولہ کتابوں میں طلاق کی بحث ہر شخص نکال سکتا ہے۔)

بالکل واضح ہے کہ ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کے بارے میں سوال وجواب ہوا ہے اگر طریقِ سُنّت سے دی ہوئی طلاقوں کی بات ہوتی تو حضورؐ یوں کہتے کہ یہ طریقہ خدا کی نافرمانی اور گناہ کا موجب ہوتا۔ جو حضرات اس ثابت شدہ حدیث کے بارے میں قیل وقال کرتے ہیں وہ سوائے اپنی بے خبری یا کج فکری ظاہر کرنے کے اور کوئی خدمت انجام نہیں دیتے۔ مولانا حامد علی صاحب نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی حیثیت ہم دلائل سے واضح کر آئے۔

رسُولُ اللہؐ کا فیصلہ نمبر (۴)

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ مطلّقہ نے کسی اور شخص سے نکاح کر لیا۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو آپؐ نے جواب دیا کہ صرف نکاح سے یہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی، جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے اسی طرح ہم بستر نہ ہو لے جس طرح پہلا شوہر ہو چکا ہے۔

بخاری شریف کتابُ الطّلاق۔ بابُ مَن اَجاز الطلاق الثلٰث۔ مُسلم شریف۔ کتاب النکاح بابُ لاتحلّ المطلقہ ثلاثاً لمطلقها۔

آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ جب کوئی شخص ایک ساتھ تین طلاقیں دے ڈالتا تھا تو اسے ان ہی الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا کہ "فلاں شخص نے تین طلاقیں دیں" ایسا کوئی لفظ بولنا ضروری نہیں سمجھتے تھے جس سے واضح ہو کہ تین الگ الگ دی گئیں یا ایک ساتھ۔ ہاں الگ الگ اوقات کی طلاقوں کا بیان ہوتا تو الفاظ سے اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اس طرح بلاریب یہاں بھی واقعہ یہی بیان ہو رہا ہے کہ کسی شخص نے بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دی تھیں اور حضورؐ نے انھیں واقع مانا۔ بخاری و مسلم کی روایات کا پایہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ جس روایت پر یہ دونوں اُستادِ فن متفق ہوں وہ حجّت کے درجۂ اعلیٰ میں سمجھی جاتی ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ فتح الباری میں اور علینیؒ عمدۃ القاری میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے جتلا بھی دیتے ہیں کہ تین طلاقوں سے مراد یہاں ایک ہی وقت کی تین طلاقیں ہیں۔ اس احتمال کے لیے کوئی قرینہ نہیں کہ ممکن ہے یہ تینوں الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں اس طرح بات بالکل صاف ہو گئی کہ حضورؐ کا فیصلہ اکٹھی تین طلاقوں کے تین ہی ہونگا

تھا نہ کہ ایک ہونے کا۔

رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ نمبر ⑤

عامر الشعبیؒ کہتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیسؓ سے گزارش کی کہ اپنی طلاق کا واقعہ مجھ سے بیان کیجیے ۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرے شوہر نے یمن جاتے وقت مجھے تین طلاقیں دی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تین ہی قرار دیا تھا۔

(ابن ماجہ: بابُ مَن طلّق ثلاثاً فِی مَجلسٍ وَاحِدٍ)

یہ حدیث مسلم شریف میں ۲۴ سندوں سے بہ الفاظ مختلفہ روایت ہوئی ہے ۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ فاطمہ بنت قیسؓ کو اکٹھی تین طلاقیں دی گئیں اور حضورؐ نے انھیں تین ہی مانا۔ ۲۴ میں دو روایتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر بینوں اور کم علموں کو دھوکا لگتا ہے کہ تینوں طلاقیں اکٹھی نہیں دی گئی تھیں ۔ لیکن ہم تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ یہ غلط فہمی ہے مسند احمد میں لفظاً بھی یہ وضاحت ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی گئی تھیں ۔ دارِ قطنیؒ کی روایت میں بھی یہی وضاحت ہے ۔ مفصّل گفتگو ہم اس پر پیچھے کر آئے ۔ " نہ مانوں" ، کی گردان کا تو کوئی علاج نہیں ۔

رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ نمبر ⑥

صحابیٔ رسولؐ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے اپنی زوجہ کو ہزار طلاقیں دے دیں ۔ پھر حضورؐ کی خدمت میں آکر مسئلہ پوچھا تو حضورؐ نے جواب دیا کہ تین تو عورت پر پڑ گئیں باقی ، ۹۹۷ ظلم کے خانے میں رکھی گئیں ۔ اللہ چاہے تو اس ظلم کو معاف کر دے چاہے تو عذاب دے ۔

(مصنف عبدالرزّاق ۔ دارِ قطنی) دارِ قطنی میں ہے طَلّق بعض اٰبائی ۔ ابنِ قیّمؒ نے مصنّف سے طلق جدّی ...... فَانْطَلَقَ اَبِیْ نقل کیا ہے ۔ اور ابن الہامؒ نے مصنف ہی سے **ان اباہ طلق فانطلق عبادۃ** نقل کیا ہے ۔ مولانا مودودی بھی ایسا ہی نقل کرتے ہیں قرینِ قیاس یہی ہے کہ واقعہ عبادہ بن صامتؓ کے والد کا ہوگا ۔ بہر حال معاملہ بالکل ظاہر ہے کہ اک دم ہزار طلاقیں دی گئیں تو حضورؐ نے تین کو واقع مان لیا اور فاضل کو تمسخر قرار دیا جو گناہ ہے ۔

رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ نمبر ⑦

حضرت علیؓ کے صاحب زادے حضرت حسنؓ نے اپنی بیوی عائشہ خثعمیہ کو ان لفظوں میں طلاق دی اذھبی فَانتِ طالق ثلاثاً (چلی جا تجھ پر تین طلاقیں ہیں) عائشہ چلی گئیں ۔ بعد میں حسنؓ کے علم میں آیا کہ عائشہ کو ان سے چھُوٹ جانے کا بڑا غم ہے تو آپ شدّتِ اثر سے رو پڑے اور حسرت سے کہا:

اگر اپنے والد ماجد علیؓ کے ذریعہ اپنے جدِّ امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ مجھ تک نہ پہنچا ہوتا کہ جو بھی آدمی اپنی زوجہ کو اکٹھی یا الگ الگ تین طلاقیں دے وہ بغیر حلالہ کے اسے پھر نکاح میں نہیں لاسکتا تو یقیناً میں خثعمیہ کو لوٹا لیتا (دارِ قطنی ص۴۳۷)

اندازہ کر لیجیے حضرت علیؓ اور حسنؓ سے زیادہ قابل اعتماد راوی کہاں ملیں گے ۔ نواسہ اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فتویٰ نقل کر رہا ہے ۔ **اگر بعض حضرات کے اس دعوے میں ذرا بھی صداقت ہوتی کہ زبانِ رسالت میں تین اکٹھی طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں تو یہ** حدیث ہی آپ کے سامنے کب آتی ؟

رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ نمبر ⑧

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کسی شخص نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دے دیں تو اب وہ اسکے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ مطلّقہ کسی اور سے نکاح کر کے ہم بستر نہ ہو لے ۔ (دارِ قطنی)

یہ گویا بارگاہِ رسالتؐ سے ایک عام ضابطۂ شرعی کا اعلان ہو گیا تین طلاقیں کسی بھی شکل میں ہوں ایک ساتھ یا الگ الگ ۔ حضورؐ نے کوئی قید نہیں لگائی ۔ قید لگانے والے سوچیں کہ انہیں کلام وحی میں اضافے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا ۔ اس طرح کی روایات کی صداقت میں جس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں ان پر ہم گفتگو کر آئے اور آئندہ بھی کرنے کو تیار ہیں ۔ ایک دُو مبہم روایات کی بات ہوتی تو گمان کیا جا سکتا تھا کہ شک کی گنجائش موجود ہے لیکن اتنی روایات اور پھر صحابہؓ کے فتوے اور جملہ معروف محدّثینؒ و فقہاؒ اور مجتہدینؒ و اساتذہ کا اتفاق ایسی گنجائش کی نفی کرتا ہے ۔ مقابلہ میں فریق ثانی جو مواد پیش کر رہا ہے اس کا حال آپ نے دیکھ ہی لیا حدیث کی حد تک تو اس کے پاس بس وہی ایک ابنِ عباسؓ والی روایت ہے ۔

جس کے مضمون میں صریحاً اضطراب اور ٹکراؤ ہے۔ پھر حضرت عباسؓ کا اس کے خلاف فتوے دینا تو گویا عام کہاوت کے اعتبار سے مدعی سُست گواہ چُست والا مضمون ہے۔ یعنی خود ابن عباسؓ تین کو تین مان رہے ہیں۔ فتوے دے رہے ہیں۔ مگر فریق ثانی ان کی روایت کو دانتوں سے پکڑے بیٹھا ہے حالانکہ ابن عباسؓ کے تمام شاگردان کا یہی مسلک بیان کرتے ہیں کہ تین تین ہوتی ہیں، ایک نہیں۔ فقط ایک شاگرد بعض مواقع پر اس کے خلاف حکایت کرگزرتے ہیں۔ پھر انہی کی دوسری حکایت وروایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی حکایت کا تعلق عام بیویوں سے نہیں بلکہ ان بیویوں سے تھا جنھیں صحبت سے قبل طلاق دے دی گئی ہو۔ لہٰذا انھیں غلط گو کہنے کے بجائے یہ کھلی گنجائش نکل آتی ہے کہ فریقِ مذکور کو کم فہمی یا غلط فہمی کا مرتکب سمجھا جائے۔ اس طرح اجماعِ امت کی بنیاد بننے والی متعدد احادیث کے بالمقابل اس فریق کے پاس ایک بھی حدیث ایسی نہیں رہتی جو اس کے دعوے اور مسلک کی تائید کرتی ہو۔ اسی لیے اس کا دعویٰ النفات کا مستحق نہیں اور اجماع میں اس دعوے سے کوئی رخنہ نہیں پڑا۔ واضح رہے کہ ہم سب کے شیخ حضرت شاہ وَلیّ اللّٰہ الدھلویؒ بھی ازالۃ الخفاء میں مذکورہ ابن عباسؓ والی روایت کو طاؤسؒ والی سند سے "اشکالِ قوی" کا مورد گردانتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں وہ علماءِ متحرین کی ایسی تاویلیں نقل کرتے ہیں جو مسلک جمہور سے مطابقت اور فریقِ ثانی کے مسلک سے منازعت ومخالفت رکھتی ہیں (اوجز المسالک ص ۳۳۱)



صحابہؓ کے فتوے

فتویٰ عبدُاللہ ابنِ مسعودؓ (۱)

"ایک شخص حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنی زوجہ کو آٹھ طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ ابن مسعودؓ نے دریافت کیا کہ دیگر حضرات اس بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ تمھاری بیوی تمھارے ہاتھ سے گئی! ابنِ مسعودؓ بولے لوگوں نے صحیح کہا۔ بات اسی طرح ہے۔"

(مؤطا امام مالک) امام مالکؒ نے حسبِ عادت یہاں کوئی سند بیان نہیں کی لیکن ابوبکر ابن ابی شیبہؒ اور بیہقیؒ اور عبدالرزاقؒ نے اسے حضرت علقمہؒ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔ امام مالکؒ کی روایت میں ابن مسعودؓ نے فتوے کا ایک اصول بھی بیان کیا ہے کہ کوئی شخص اگر غلط طریقہ اختیار کرکے اپنے آپ کو مخمصے اور شبہات کی دلدل میں پھنسائے تو اس کے نتائج خود اسی کو بھگتنے ہوں گے مفتی کا منصب نہیں کہ خود کو ان میں پھنسائے اسے تو ظاہر کے مطابق فتویٰ دینا چاہیے۔ (ومن لبّس علی نفسہ لبساجعلنا لبسہ بہ لاتلبسُوا علی انفسکم ونتحمّلہ عنکم۔

ابن مسعودؓ کے جواب سے یہ بھی نشاندہی ہورہی ہے کہ اس وقت کے دیگر اہلِ فتاء بھی تین کے وقوع ہی کا فتویٰ دیتے تھے۔

فتویٰ عبدُاللہ ابنِ عمرؓ (۲)

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ ابنِ عمرؓ سے جب کسی ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جاتا جس نے بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں تو، وہ جواب دیا کرتے کہ اگر تم

ایک یا دُو طلاقیں دو تو یہ وہ معاملہ ہے جس میں رسول اللہ ؐ نے مجھے رجوع کا حکم دیا تھا۔ لیکن اگر تین دو تو عورت حرام ہو جائے گی اور حلالے کے بغیر حلال نہ ہو گی۔

(بخاری شریف کتابُ الطّلاق بابُ مَن قال لامراتہ انتِ علی حرام)

مسلم شریف میں مزید الفاظ یہ ہیں:

"تین طلاق سے عورت جدا ہو جائے گی اور تم گناہ گار ہو گے کیوں کہ تم نے اس طریقہ سے فرار کیا جس کی ہدایت اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کے معاملہ میں دی تھی۔"

ابن ابی شیبہؒ اور دارِ قطنیؒ بھی اس ٹکڑے کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں (فتح القدیر مع ہدایہ جلد ۲ ص ۱۴۸) دارِ قطنی میں یہ روایت چار مختلف سندوں سے موجود ہے۔

اگر مُسلم اور دیگر کُتب مذکور کے اس زائد ٹکڑے کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور نہ ملحوظ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تو یہ ایک بالکل سامنے کی بات بن جاتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تین طلاقوں کا بیان فرما رہے ہیں جو غیر مسنون طریقہ پر وقت واحد میں دے دی جائیں۔ اگر مسنون طریقہ پر دی گئیں تو خدا کی نافرمانی اور گناہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

لیکن غور کیجیے تو خود بخاری والا متن بھی اسی صورت واقعہ پر صاف دلالت کر رہا ہے۔ اس لیے کہ الفاظ یہ ہیں لَو طَلَقتُ مَرّۃ اَو مَرّتَین (اگر تم نے ایک یا دُو طلاقیں دی ہیں تو یہ وہ معاملہ ہے جس میں رسول اللہ ؐ نے مجھے رجعت کا حکم دیا تھا) بہت سے بہت اس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے "اگر تم نے ایک بار یا دو بار طلاق دی ہے اور یہ ترجمہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ فقرہ مختلف وقتوں کی طلاقوں کے لیے ہے لہٰذا جب اس کے بعد ابن عمرؓ یہ کہتے ہیں کہ اگر "تیسری طلاق دی"، تو ان کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اگر تیسرے وقت میں تیسری طلاق دی"، گویا حکمِ رسول ؐ کا تعلق تین الگ الگ وقتوں میں دی ہوئی طلاقوں سے ہو گیا ایک وقت کی طلاقوں سے نہیں۔

چنانچہ مولانا حامد علی صاحب نے دوسروں کی نقل میں یہی بات کہی بھی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ: طلقتھا ثلٰثًا کا مفہوم تین بار طلاق بھی ہو سکتا ہے۔"

لیکن ہم افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ اصلاً جس نے بھی یہ احتمال آفرینی کی وہ یا تو

عربی زبان جانتا ہی نہیں یا جان بوجھ کر مغالطہ دے رہا ہے۔ حدیث کا لفظ ہے ثلٰث نہ کہ ثالث۔ حضرت ابن عمرؓ کا مفہوم یہی ہوتا کہ دو وقتوں میں دُو طلاقین دینے کے بعد تیسرے وقت میں تیسری طلاق دو گے تو انکے الفاظ یوں ہوتے فان طلقتھا ثالثا (دُو کے بعد پھر اگر تیسری دو گے لیکن وہ "تیسری"، نہیں بلکہ تین (ثلٰث) کہہ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اوقات کا وہ فرق ان کے پیشِ نظر نہیں جسے زبردستی ان کے منہ میں ڈالا جا رہا ہے۔ تین اور تیسری کا فرق واضح ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مَرّۃً اور مَرّتَین کہنے سے ان کی مراد الگ الگ اوقات نہیں بلکہ محاورے کے مطابق یہ الفاظ واحدا اور اثنین (ایک اور دو) کے مفہوم میں بولے گئے ہیں۔

فتویٰ حضرت علیؓ (۳)

وکیع اعمشؒ سے اور اعمش حبیبؒ سے اور حبیب ابو ثابتؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دی ہیں حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یہ بیوی تین طلاقوں کے ذریعہ تجھ سے جدا ہو گئی اور بقیہ کو اپنی دوسری بیبیوں میں بانٹ دے **(۱) فتح القدیر مع ہدایہ جلد ۲ ص ۱۴۸ کتاب الطّلاق۔ (۲) تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۵۵۶ بحوالہ سنن وکیع بن الجراح (۳) سنن کبریٰ جلد ہفتم ص ۳۳۵ (۴)** شرح معانی الآثار جلد ۲ ص ۴۴)

ابراہیم محمد بن شریکؒ بن ابی نمرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت علیؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی بیوی کو عَرفَج کے درختوں کے برابر طلاقیں دے دی ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ان میں سے تین لے لو باقی چھوڑ دو (مصنّف عبدالرزاق)

مصنف عبدالرزاق ہی میں تین ممتاز صحابہ علیؓ، ابنِ مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ اگر صحبت سے قبل منکوحہ کو تین طلاقیں عدد کی صراحت کے ساتھ بیک لفظ دے دیں (یعنی تجھ پر تین طلاق) تو تین ہی پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر یہ عورت دوبارہ زوجیت میں نہ آ سکے گی۔ اور اگر الگ الگ فقروں میں تین دی ہیں تو پہلی ہی طلاق سے وہ جدا ہو جائے گی اور بقیہ دُو بے کار جائیں گی اب گویا حلالہ کے بغیر بھی دوبارہ اس سے نکاح ممکن ہے۔

ہم بتا ہی چکے ہیں کہ غیر مدخولہ (جس سے صحبت نہ ہوئی ہو) چوں کہ بحکمِ شریعت ایک ہی طلاق سے جدا ہو جاتی ہے حق رجوع مرد کو نہیں رہتا اس لیے مزید طلاقیں اب اس پر پڑیں گی کیسے۔ طلاق تو بیوی پر پڑتی ہے۔ ایک ہی طلاق نے اسے زوجیت سے نکال دیا۔ البتہ اکٹھی تین دیں تو دیکھ لیجیے تین جلیل القدر صحابیؓ جن میں حضرت علیؓ بھی شامل ہیں یہی کہہ رہے ہیں کہ تینوں پڑ جائیں گی۔ اس طرح متعدد روایات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مسلک و فتویٰ معلوم ہو جانے کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ اگر سندوں میں کسی طرح کا ضعف بھی ہو تو انھیں رد کر دیا جائے۔ متعدد ضعیف روایات ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اور جب یہی مضمون قوی روایات اور قرائن اور دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہو رہا ہو تو اصولِ فن کے مطابق ان تقویت یافتہ روایات سے شہادت اور کمک کا کام لیا جا سکتا ہے۔

فتویٰ حضرت عثمانؓ ④

معاویہ بن ابی یحییٰؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عثمانؓ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دی ہیں آپ نے جواب دیا بانت منک بثلاث (تیری بیوی تین طلاقوں کے ذریعہ تجھ سے جدا ہو گئی)

(۱) فتح القدیر مع ہدایہ جلد ۲ ص ۱۴۸) (۲) **تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۵ بحوالہ سننِ وکیع بن الجراح)**

مصنف عبدالرزاق میں یہی واقعہ دوسری سند سے موجود ہے (قال ابراھیم واخبرنی ابوالحویرث عن عثمان بن عفان) ابن حزمؒ نے المحلّی میں ایک اور سند سے (وکیع عن جعفر بن برقان عن معاویہ بن ابی یحییٰ) اسی واقعہ کو بیان کیا (جلد ۱۰ ص ۱۷۲)

مصنف عبدالرزاق میں ایک اور واقعہ دو ایسی سندوں سے بیان کیا گیا ہے جن میں ایک سند تو اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اس واقعہ سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ بلا کسی ریب و تامل کے یہی یقین رکھتے تھے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے کہ جتنی بھی طلاقیں شوہر کے قبضے ہیں وہ اگر ایک ساتھ دے دی جائیں تو واقع ہو جاتی ہیں۔ اعلیٰ ترین سند یہ ہے عبدالرزاق عن معمّر عن الزہری عن ابن المسیّب قال: قضی عثمان الخ۔ کیا کسی

منصف مزاج ماہرِ فن میں جرأت ہے کہ ان میں سے ایک بھی راوی پر انگشت نمائی کر سکے۔ یہ سب صحاحِ ستہ کے راوی ہیں۔ جن لوگوں کی عادت یہ بن گئی ہے کہ اپنے خلاف پڑنے والی حدیث کو ضعیف ثابت کرنے کے لیے راویوں کے خلاف ایک آدھ مجمل جرح اٹھا لاتے ہیں اور تعدیل کو دبا جاتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ شوشہ چھوڑ سکتے ہیں کہ عبدالرزاق میں تشیّع تھا۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ وہ یہ کہہ بیٹھیں کہ عبدالرزاقؒ شیعہ تھے۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ اگر کتبِ فن میں کسی راوی کے بارے میں کسی بزرگ نے یہ کہہ دیا کہ فلاں راوی میں فی الجملہ تشیّع تھا۔ یا تشیّع کی بو باس تھی تو بعض فنکاروں نے بالکل غلط طور پر اس کا ترجمہ پیش فرما دیا کہ فلاں راوی شیعہ تھا۔ حالانکہ اساتذۂ فن نے بار بار جتلایا **ہے کہ خبردار اس کا یہ مطلب مت** لے لینا۔ شیعہ ہونا اور بات ہے اور فی الجملہ تشیّع ہونا اور **بات ہے چنانچہ بعض حضرات نے** امام ابو حنیفہؒ تک میں تشیّع کا قول کر دیا ہے۔

عبدالرزاقؒ حضرت معمّرؒ کے امتیازی شان رکھنے والے جلیل القدر شاگرد ہیں۔ معمّرؒ کی روایات ان سے زیادہ شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ امام اوزاعی امام ابن جریج اور امام ثوریؒ سے انھوں نے کافی استفادہ کیا ہے۔ ان کے تشیّع کا حدود اربعہ انکے اس قول سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھ میں یہ جرأت نہیں کہ حضرت علیؓ کو حضرت صدیقؓ و حضرت عمرؓ پر ترجیح دوں۔

رہے معمّرؒ، زہریؒ اور ابن المسیّبؒ تو یہ تو بخاری و مسلم سب کے یہاں اعلیٰ درجۂ ثقاہت پر فائز ہیں۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کا فتویٰ اور مسلک ثبوت کے رُخ سے قطعًا بے غبار ہو جاتا ہے۔

فتویٰ حضرت عمرؓ ⑤

اگرچہ سیدنا حضرت عمرؓ کے فتوے کی نقل ضروری نہیں تھی کیوں کہ ان کے بارے میں فریقِ ثانی بھی تسلیم کرتا ہے کہ انھوں نے تین طلاقوں کے نفاذ کا آرڈر جاری فرمایا لیکن اس غلط فہمی کی اصلاح کے لیے یہ آرڈر سیاسی و سرکاری تھا فتویٰ نہ تھا، طحاوی میں ان کا یہ فتویٰ موجود ہے کہ صحبت سے قبل منکوحہ کو تین طلاقیں دے دی جائیں تو تینوں پڑ جاتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ تین پڑنے کی بات "سرکاری" نہیں شرعی ہے۔ پھر دارِ قطنی نے جو روایت نقل کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحبت کی ہو نہ کی ہو دونوں صورتوں میں حضرت

عمرؓ تین کے وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو جو خط تحریر فرمادیا تھا اس میں یہ الفاظ ہیں جس نے تین بار اَنْتِ طالِقٌ کہا تو یہ تین طلاقیں ہیں (کما اخرجہ ابو نعیم۔ سعید بن منصور

فتویٰ حضرت عمرو بن العاصؓ ⑥

کسی شخص نے حضرت عمروؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی آدمی صحبت سے پہلے اپنی منکوحہ کو تین طلاقیں دے ڈالے تو اس کا حکمِ شرعی کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ایک طلاق دینے سے تو منکوحہ بائنہ ہو جائے گی (یعنی ایسی جدا کہ رجوع نہیں کر سکتے البتہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں بشرطیکہ عورت راضی ہو) اور تین طلاقوں سے ایسی حرام ہو جائے گی کہ حلالے کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(مؤطا امام مالک۔ طحاوی۔ مباحث طلاق)

سننِ ابوداؤد میں بھی اور سننِ سعید بن منصور میں بھی حضرت عمروؓ کے ساتھ ساتھ علاوہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہم کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے کہ غیر مدخولہ پر ڈالی گئیں تین طلاقوں کو وہ مغلّظ قرار دیتے تھے کہ حلالہ کے بغیر حلال ہی نہ ہو۔

سعید بن منصورؒ کا نام چونکہ عام طور پر شہرت یافتہ نہیں اس لیے چند تعارفی الفاظ حوالۂ قلم ہیں:

یہ پہلی صدی ہجری کے علماء میں ہیں ۲۲۹ھ میں مکہ میں انتقال فرمایا۔ پورا نام ہے سعید بن منصور بن شعبہ مروزی، کنیت ہے ابوعثمان۔ بعض دیگر محدثینؒ کے علاوہ امام مالکؒ سے استفادہ کیا۔ امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام احمدؒ جیسے اکابر سے کافی روایت کرتے ہیں۔ ان پر جرحیں یقیناً کی گئی ہیں لیکن تعدیل بھی کی گئی ہے۔ امام احمدؒ اور ابوحاتمؒ جیسے اساتذہ انکی توثیق کرتے ہیں۔ ان کی بے شمار روایات "ثلاثی" ہیں یعنی محض تین واسطے۔ ایسی سندیں محدثین کے یہاں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔

اس تفصیل کا منشاء یہ نہیں کہ مروزیؒ پر کلام نہیں کیا جا سکتا مگر یہ منشاء ضرور ہے کہ جب دیگر قوی شواہد موجود ہیں تو ان کی روایات نظرانداز بھی نہیں کی جا سکتیں۔ امام مالکؒ سے بڑھ کر شاہد اور مؤیّد اور کون چاہیئے۔

فتویٰ حضرت ابنِ عباسؓ ⑦

① ابوداؤد شریف میں "تطلیقات ثلٰثہ" کے زیرِ عنوان حضرت ابنِ عباسؓ کا ایک تفصیلی ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے آیت قرآنی وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ الآیۃ کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے یہ تھا کہ کوئی شخص چاہے تین ہی طلاق دے چکا ہو مگر وہ رجعت کا حق رکھتا تھا۔ اس آیت نے قانونِ شرعی کی اطلاع دی کہ طلاقیں تو بس دو ہی ہیں، جن سے رجوع ہو سکتا ہے تین سے رجوع نہیں ہو سکتا۔

قابلِ غور یہ ہے کہ آیاتِ طلاق نازل ہونے سے قبل تو اس کی بحث ہی نہ تھی کہ طلاقِ سُنّت کیا ہے اور طلاق بدعی کیا ہے؟ یہ سب تو بعد میں سامنے آیا کہ تین الگ الگ طہروں میں طلاقیں دینی چاہییں۔ لہٰذا ابنِ عباسؓ جس زمانے کا حال بیان کر رہے ہیں اس وقت دو، تین، چار جتنی بھی طلاقیں دی جاتی ہونگی اور بیک وقت بھی۔ ایسی کوئی وجہ موجود نہ تھی کہ ایک ہی وقت میں متعدد طلاقیں دے ڈالنے کو آدمی گناہ سمجھے۔ اب اگر ابن عباسؓ یہ کہتے ہیں کہ آیت نے اس طریقے کو منسوخ کر کے حق رجعت دو طلاقوں میں محدود کر دیا اور تین طلاقیں مغلظہ بن گئیں تو گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تین طلاقیں خواہ الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں یا ایک ہی وقت میں قرآن نے حق رجعت منسوخ کر دیا۔ یہ مطلب کسی طرح نہیں نکالا جا سکتا کہ نسخ صرف اس صورت میں ہے جب الگ الگ وقتوں میں دی گئی ہوں۔

② ابوداؤد ہی میں واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ بیوی کو اک دم تین طلاقیں دے آیا ہے۔ ابن عباسؓ چپ رہے۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ابنِ عباسؓ ناخوشگوار لہجے میں بولے۔ تم میں سے ایک شخص حماقت کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور چیختا ہے کہ اے ابن عباسؓ، اے ابن عباسؓ! حالاں کہ اللہ نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرے گا کوئی نہ کوئی راہ کھل جائے گی۔ تو اللہ سے نہیں ڈرا اب میرے پاس تیرے لیے کوئی گنجائش کہاں دھری ہے۔ تو نے خدا کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی۔

تفسیر ابن جریر میں بھی یہ روایت موجود ہے۔)

③ کسی نے بیوی کو سو طلاقیں جھونک دیں اور ابنِ عباسؓ سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ تین طلاقوں سے تو عورت جدا ہو گئی اور باقی

موجبِ عذاب نہیں کہ ان کے ذریعہ اللہ سے تمسخر کیا گیا۔

(مؤطا امام مالک۔ دارقطنی۔ طحاوی۔ مبحث طلاق)

اسے ابن عباسؓ کے چھ شاگرد نقل کرتے ہیں۔

④ طحاوی ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک بھتیجے صاحب نے چچا کے بارہمیں ابن عبّاسؓ کو بتایا کہ وہ دفعتاً تین طلاقیں دے بیٹھے ہیں۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ تیرے چچا نے خدا کی حکم عدولی کی اور شیطان کا پیرو بنا۔ لہٰذا اللہ نے اس کے لیے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔

⑤ کسی صاحب نے صحبت سے قبل ہی منکوحہ کو تین طلاقیں جھاڑ دیں۔ پھر جی چاہا کہ دوبارہ نکاح کرلیں۔ اب فتویٰ پوچھنے نکلتے ہیں واقعہ کے راوی ابن بکیر بیان کرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا دونوں صحابیوں کا جواب ایک ہی تھا۔

"اے شخص تو نے خود ہی اس گنجائش کو ختم کردیا ہے جو تجھے حاصل تھی۔"

یعنی بجائے ایک کے تین دے بیٹھا۔ اب کیا پوچھتا پھرتا ہے۔

(مؤطا امام مالک۔ سنن ابی داؤد)

فتویٰ حضرت ابوہریرہؓ ⑧

اوپر کی روایت نمبر ۵ سے اور ابن عمرو بن العاصؓ کے فتوے کے ہم رشتہ ابو ہریرہؓ کا فتویٰ علم میں آچکا۔ مزید توثیق مؤطا اور طحاوی میں بیان شدہ روایت سے ہوتی ہے جو اسی کے مثل ہے۔

فتویٰ حضرت انسؓ ⑨

ایک وقت میں دی گئی تین طلاقوں کے سلسلہ میں حضرت انسؓ بھی یہی فتویٰ دیتے تھے کہ اب حلالہ کے بغیر کوئی صورت تجدید تعلق کی نہیں۔ (طحاوی)

فتویٰ حضرت مغیرہؓ بن شعبہؓ ⑩

امام بیہقیؒ اپنی سنن میں سند کے ساتھ قیس بن ابی عاصمؓ کا یہ بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے

سامنے ایک شخص نے مغیرہؓ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جس نے فرطِ غضب میں بیوی کو اک دم سو طلاقیں دے ڈالی ہوں۔ مغیرہؓ نے جواب دیا کہ تین سے تو بیوی حرام ہوگئی اور ۹۷ فالتو ہیں۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی اغاثۃ اللہفان میں یہ روایت نقل کی ہے اور سکوت اختیار فرمایا ہے کوئی ردّ و قدح نہیں کی۔

فتویٰ حضرت عمران بن حصینؓ ⑪

ابوبکر ابن ابی شیبہؒ سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ صحابیٔ رسول عمران بن حصینؓ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے ایک ہی مجلس میں بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ شخص گناہ گار بھی ہوا اور اس کی بیوی بھی اس پر حرام ہوگئی۔

اس اثر کو علامہ ترکمانیؒ نے بھی الجوہر النقی میں روایت کیا ہے اور ابن قیمؒ اسے بیہقیؒ کے حوالے سے اغاثہ میں بھی نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے سند نقل نہیں کی مگر ردّ و قدح بھی مطلق نہیں کی جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ سند ان کے نزدیک صحیح تھی اور روایت انہوں نے قبول فرمالی۔

فتویٰ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ⑫

اور دارقطنی نے صحابیِ رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے صاحب زادے ابوسلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کی ماں تماضر بنت الاصبغ کو حضرت ابن عوفؓ نے تین طلاقیں ایک جملہ میں دیں۔ یعنی "تجھ پر تین طلاق"، کہہ کر اپنے سے جدا کیا (ملاحظہ ہو دارقطنی جلد دوم صفحہ ۴۳)

یہ اگرچہ حضرت ابن عوفؓ کا عمل ہے اصطلاحاً اسے فتویٰ نہیں کہتے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تو فتوے سے بھی زیادہ قوی گواہی ہے اس بات کی کہ وہ اکٹھی تین طلاقوں کے سلسلہ میں وہی رائے رکھتے تھے جو باقی صحابہؓ کی تھی۔ رائے کیا یوں کہیے علم ـــــ یہ تو دراصل قطعی قانونِ شرعی تھا کہ تین اکٹھی دو گے تو تین ہی پڑیں گی۔ اسی کے مطابق صحابہؓ کے فتوے بھی تھے اور ان کا تعلق اجتہاد سے نہیں معلوم و مسلم قانون سے تھا۔